۴۸۶

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ (ص ۳)

(اس مبارک کتاب کو ہم نے تم پر اس لئے نازل کیا ہے کہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں)

انوارِ تفکر

از

عطاء اللہ پالوی

چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد "قرآں" جہانے دیگرش
(اقبال)

سنگم کتاب گھر :- جامعہ نگر نئی دہلی (صدر دفتر)
اردو بازار دہلی (شاخ)

بارِ اوّل جنوری ۱۹۵۶ء

تعداد ۱۰۰۰

2.97.1226

9111E

قیمت ۱۲/ ؏

نئی قیمت -/3 ٹ دستِ کور کے پشت پر چھپی ہے

مطبوعہ

یونین پرنٹنگ پریس عقب سنگم کتاب گھر
جامع مسجد دہلی

فاش گویم آنچه در دل مضمر است

این کتابی نیست چیزی دیگر است

اقبال

اس کتاب کا مسودہ ۱۴ر ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ (۱۴ر اگست ۱۹۵۴ء) کو دفتر میں موصول ہوا تھا، کتاب کے متعلق مصنف کا اقبال کی زبان میں دعویٰ تھا کہ :-

فاش گویم انچہ در دل مضمرست

ایں کتابے نیست چیزے دیگرست

لہٰذا میں نے یہ مسودہ محترم حافظ اسلم صاحب جیراجپوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ملاحظہ کے لئے بھیجدیا تھا، علامہ مرحوم نے مسودہ کے ملاحظہ کے بعد جس مختصر رقعہ میں اپنی رائے ظاہر فرمائی تھی، وہ بجنسہ درج ذیل ہے۔ اس کتاب کی اشاعت میں چند وجوہ سے غیر معمولی تاخیر ہوگئی اور مجھے بے حد افسوس ہے کہ علامہ موصوف اس کتاب کو چھپی ہوئی نہ دیکھ سکے جس کے وہ بے تابی کے ساتھ منتظر تھے۔ فقط

فیاض احمد

جناب حافظ فیاض احمد صاحب

السلام علیکم۔ آج جو کتاب آپ نے بھیجی وہ میں نے دیکھ لی، قرآنی تحقیق سے متعلق ہے۔ خاصی مفید ہے۔ اس کو چھپ جانا چاہئے۔ عطاء اللہ صاحب ماشاء اللہ اس شاہراہ میں خاصے چل رہے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان کو مزید توفیق اور صحیح فہم عطا فرمائے۔ فقط۔

محمد اسلم ، جامعہ نگر دہلی

۱۰ر محرم ۱۳۷۴ھ

حرفِ اوّل

"الہلال" کے سات نمبر نکل چکے تھے کہ ایک شخص نے امام الہند حضرت علامہ ابوالکلام آزاد کو ایک خط لکھا جس میں یہ بھی لکھا کہ :-

"آپ کی نظر قرآن مجید اور اس کے حقایق و معارف پر کیسی وسیع اور گہری ہے ؟ ...... اور علم و فضل بالخصوص مذہبی معلومات کا درجہ تو میری تعریف سے بھی بلند ہے، یہ چیزیں ہمیشہ ہماری بدقسمت قوم کو میسر نہیں آتیں"

اس کے جواب میں علامہ آزاد نے "الہلال" مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء میں تحریر فرمایا کہ :-

"بلاشائبہ انکسار عرض کرتا ہوں کہ اس کی اہلیت کسی طرح اپنے اندر نہیں پاتا، ممکن ہے کہ مذہبی باتیں تھوڑی بہت مجھے معلوم ہوں، لیکن "قرآن کریم" کے معارف تو اتنے ارزاں نہیں جنکو میں اپنی حرف شناسی دے کر خرید سکوں، میں تو ان کے خط میں اپنی نسبت ایسے الفاظ دیکھ کر بے اختیار کانپ اٹھا، اگر اس کے حقایق و اسرار کے فہم کے لئے "عربی دانی" کی ضرورت ہوتی تو میں "عربی" کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں، اگر "مذہبی معلومات" کی ضرورت ہوتی تو ان کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا، اگر کتب

"تفاسیر" کے مطالعے کی ضرورت ہوتی تو کتابوں کی میرے
پاس کمی نہ تھی لیکن اس کے لیے یہ تمام باتیں بیکار ہیں، پہلی شرط
"اتقا" اور "تزکیۂ قلب" ہے اور ساری محرومی اسی میں
ہے کہ اس سے محروم ہوں۔ جو دل زادِ تقویٰ سے محروم اور ہوائے
نفسانی و آلائشِ دنیا پرستی میں گرفتار ہے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی
"قرآن" کے حقائق و معارف کا تجلی گاہ نہیں بن سکتا "علم و فضل"
اس کے لئے بے کار ہے اور ذہن و دماغ کو یہاں کوئی نہیں پوچھتا
ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ

از منطق و حکمت نکشاید در محبوب
اینها بہ ارائش افسانۂ عشق است

یقین فرمایئے کہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں بالکل سچ ہے "قرآن" کے
اسرار و معارف میں ایک "غیر متقی" انسان کے لئے کوئی حصہ
نہیں، گو وہ "علم و فضل" کے تمام مدارج طے کرلے، انصاف
فرمایئے کہ جب حالت یہ ہو تو پھر میری اس مقام میں کیا ہستی ہے؟"

یہ ہے وہ جواب، جو حضرت آزاد نے اس مستفسر کو دیا تھا۔ اور بھلا جب صاحبِ علم
و فضل علامہ آزاد یہ فرمائیں کہ "قرآن" کے حقایق و معارف سمجھنے کے لئے "علم
و فضل" کی ضرورت نہیں بلکہ صرف "متقی" ہونے کی ضرورت ہے اور چونکہ
"تقویٰ" سے وہ محروم ہیں اس لئے "قرآن" کے اسرار و رموز سمجھنے کے حقدار نہیں،
تو بھلا میری کیا مجال ہے کہ میں اس امر میں کچھ بول سکوں جب کہ مجھے نہ "تقویٰ"

و "تزکیہ" میں ہی کوئی ادنیٰ مقام بھی حاصل ہے اور نہ "علم و فضل" ہی میں کوئی دخل ہے؟

ہاں البتہ زیرِ نظر کتاب میں زیرِ بحث مسائل و مقاماتِ قرآن سے متعلق میں نے جو کچھ سمجھا ہے اسے اس خیال سے پیش ضرور کر رہا ہوں کہ بقول علامہ آزاد :-

"تقلید" کے "اہرمن" سے بڑھ کر انسان کی تمام "یزدانی" خصائل کا اور کوئی دشمن نہیں، انسانی اعمال کی جسقدر گمراہیاں ہیں ان سب کی تخم ریزی صرف "تقلید" ہی کی زمین میں ہوتی ہے اس لئے راہِ اصلاح کا اوّلین منظریہ ہے کہ تقلید پرستی کے سلاسل و اغلال سے انسانوں کو نجات حاصل ہو، خدا تعالیٰ نے ہر انسانی دماغ کو سوچنے والا اور ہر آنکھ کو دیکھنے والا بنایا ہے :-

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (بلد ۱)	کیا ہم نے انسان کو دیکھنے کے لئے دو آنکھیں نہیں دیں؟ اور بولنے کیلئے زبان اور لبیں نہیں عطا کیں؟ اور پھر ہدایت و ضلالت کی دونوں راہیں اس کے سامنے نہیں کھول دیں؟"

اس لئے ہر انسان اپنی ہدایت و گمراہی کا ذمے دار اور اپنے فکر و دماغ سے کام لینے کے لئے خود مختار ہے لیکن انسان کی تمام قوتیں نشو و نما کی محتاج ہیں اور نشو و نما ہو نہیں سکتی، جب تک قوتوں کو بغیر کسی سہارے کے خود، ورزش کرنے کے لئے چھوڑ نہ دیا جائے، انسان چلنے کی قوت اپنے

ساتھ لے کر آتا ہے مگر بچے کو جب تک خود کھڑا ہونے اور پاؤں پر زور دینے کے لئے چھوڑ نہ دیجئے گا، کبھی اس کے پاؤں نہ کھلیں گے۔

"تقلید" سے پہلی ہلاکت جو انسانی دماغ پر چھا جاتی ہے وہ یہی ہے کہ انسان اپنے چند پیشواؤں اور مقتداؤں کی تعلیم یا آبا و اجداد کے طریق، رسوم اور آراء پر اپنے تئیں چھوڑ دیتا ہے اور صرف ان ہی کا تعبّد کرتے کرتے خود اپنی قوتوں سے کام لینے کی عادت بھول جاتا ہے، اس عالم میں پہونچ کر اس کی حالت بالکل ایک چارپائے کی سی ہو جاتی ہے اور انسانی ادراک و تعقّل کی تمام علامتیں مفقود ہونے لگتی ہیں۔ انسان کا اصل شرف نوعی اور مابہ الامتیاز اس کے دماغ کا تدبر و تفکّر اور اجتہاد و تجسّس ہے، دنیا میں جسقدر علوم و فنون کا انکشاف ہوا، قوانینِ الٰہیہ اور نوامیسِ فطریہ کے چہروں سے جس قدر پردے اُٹھے، اشیائے کائنات کے خواص کا جو کچھ سراغ لگا، تمدن و مصنوعات میں جسقدر ترقیاں ہوئیں، نئے نئے آلے اور نئے نئے وسائلِ راحت جس قدر ایجاد ہوتے، غرض کہ انسان کے ارتقائے ذہنی و فکری کے جس قدر کرشمے دنیا میں نظر آرہے ہیں یہ تمام تر اسی انسانی تفکّر و تدبّر کے نتائج ہیں۔ لیکن "تقلید پرستی" کی عادت، ہلاکت و بربادی کی ایک چٹان ہے، جو انسانی تفکر و تدبر اور ادراک و تعقّل کی تمام قوتوں کو کچل ڈالتی ہے اور اس کی قوتِ نشو و نما کا دائمی سدّباب کر دیتی ہے، قرآن کریم جس دعوت کو لے کر آیا فی الحقیقت

اس کا اصل مقصد یہی تھا کہ " تقلید " اور " استبدادِ فکری " کی زنجیروں سے انسان کو نجات دلائے، بُت پرستی اور انسان پرستی کی تمام شاخیں بھی اسی تقلیدِ آباء و رسوم سے پیدا ہوتی ہیں، اسی لئے قرآن نے اپنی " تعلیمِ توحید " کا اساس بھی انسان کی اجتہادِ فکری پر رکھا اور تفکر پر زور دیا:-

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ؕ
(محمد ۳)

کیا لوگ اپنے دماغ سے قرآن پر غور نہیں کرتے؟ یا ان کے دلوں پر قفل لگ گئے ہیں۔؟

" مقلّدینِ محض " کو " چارپایوں " اور " حیوانوں " سے تشبیہ دی اور پھر اس کو بھی اظہارِ ضلالت کے لئے ناکافی قرار دیکر " ان سے بھی بدتر " فرمایا:-

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ
(اعراف ۲۲)

اُن کے پاس دل و دماغ ہیں مگر نہیں سمجھتے، آنکھیں ہیں پر نہیں دیکھتے کان ہیں مگر نہیں سنتے خود اپنے ذہن سے کام نہ لینے اور مقلّدِ محض ہونے میں وہ مثل چارپایوں کے ہیں بلکہ ان سے بھی گمراہ تر!"

اب بہ قول علامہ آزاد جس طرح " قرآن " دوسروں کے سمجھنے کے لئے ہے اسی طرح مجھے بھی حق حاصل ہے کہ میں بھی اس پر غور و فکر کروں، اور جس طرح میں قطعی طور پر دوسروں کی رائے کا پابند نہیں بنایا جاسکتا، اسی طرح دوسرے بھی، میرے خیال سے اتفاق کرنے

پر مجبور نہیں ہیں، البتہ جس طرح میں نے دوسروں کی تفسیریں، تحریریں اور رائیں پڑھی اور دیکھی ہیں کہ شاید وہ میری رہنمائی کر سکیں، اسی طرح، میں بھی اس کا متوقع ہوں کہ اہلِ علم و اہلِ بصیرت حضرات میری اس کتاب کو لائقِ توجہ اور قابلِ اعتنا سمجھ کر تفکر و تدبر کا منبع قرار دیں گے، اس کتاب سے اُن کی بصیرت میں چاہے اضافہ نہ ہو مگر وہ مجھے تو میری غلطیاں بتا دیں گے۔

پورے "قرآن" کی مستقل تفاسیر لکھنے کا رواج تیسری صدی ہجری سے شروع ہوا ہے، اور آج تک قائم ہے اور اس درمیان میں اتنی تفسیریں لکھی گئی ہیں کہ کسی کو اُن کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہے مگر متقدمین ہوں یا متاخرین جنھوں نے بھی اپنے سے پہلے کی تفسیروں سے مطمئن نہ ہو کر، نئی تفسیر لکھی، سب ہی نیک نیت تھے اور ان کے تعبیرات اپنے اپنے ادوار کے لئے، اپنے اپنے عصری تقاضوں کے مطابق تھے۔ انھوں نے جو کچھ، جتنا کچھ اور جیسے کچھ، خود سمجھا دوسروں کو بھی سمجھانا چاہا۔ لہٰذا اُن کی پُرخلوص خدمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، خدا اُنھیں جزائے خیر دے۔

"تفاسیر" ہمارے بزرگوں کی کمائی اور "روایات" ہمارے دین کا تاریخی سرمایہ ہیں۔ اور کسی قوم کے لیے، اس سے زیادہ بدبختی اور بے حمیتی کی اور کیا بات ہوگی کہ وہ اپنے بزرگوں کی کمائی کھو دے یا اپنی تاریخ کو ضائع کر دے، لہٰذا اس لٹریچر سے استفادہ تو درست ہے مگر استمساک نادرست، کیونکہ وہ تمام تفاسیر اپنے اپنے عہد کے لیے تھیں۔ اور کسی ایک عہد کی تفسیر و تعبیر دوسرے عہد کیلئے نہ حجت ہو سکتی ہے اور نہ مفید، بالخصوص اس لیے اور بھی کہ: — بقول علامہ آزاد:-

"چوتھی صدی ہجری کے بعد، علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ دَور ختم ہو گیا اور شواذ و نوادر کے علاوہ، عام شاہراہ "تقلید" کی شاہراہ ہو گئی، اس "داء عضال" نے جسم تفسیر میں بھی پوری طرح سرایت کی، ہر شخص جو "تفسیر" کے لئے قدم اٹھاتا تھا، کسی پیش رو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا اور پھر آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چلتا رہتا، اگر تیسری صدی میں کسی "مفسر" سے کوئی "غلطی" ہو گئی ہے تو ضروری ہے کہ نویں صدی کی تفسیروں تک وہ برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے، کسی نے اس کی ضرورت محسوس ہی نہیں کی کہ چند لمحوں کے لئے "تقلید" سے الگ ہو کر "تحقیق" کرے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے؟ ——"

(ترجمان القرآن جلد ١ صفحہ ١٤)

ظاہر ہے کہ ایسی تفسیروں کا، اگرچہ وہ لاتعداد ہیں مگر اس وقت ان کا کوئی فائدہ نہیں، ان کا حال، بہ قول علامہ عبد الباری ندوی پروفیسر جامعہ عثمانیہ یہ ہے کہ:—

"جہاں اور جس مقدار میں اس "کلام اللہ" کے ساتھ تفسیر وغیرہ کی صورت میں "کلام الناس" کو شریک کیا اُسی قدر، ہمیشہ نہیں لیکن زیادہ تر ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ جو روشنی ملی تھی اس کی جگہ پھر تاریکی چھانے لگی ——"

(میری محسن کتابیں صفحہ ٢٦)

دوسری بات یہ ہے کہ اُس وقت لوگ تفاسیر کا انداز یہی مناسب سمجھے اور آج تک سمجھتے ہیں کہ " ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ " سے شروع کر کے " مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ " تک ضرور ہی کچھ نہ کچھ لکھنا چاہیئے، چاہے اس کے درمیان کا کتنا ہی بڑا حصہ، خود اپنی سمجھ سے باہر ہی کیوں نہ ہو، علامہ عبدالباری ندوی نے خوب فرمایا ہے کہ :-

" لوگ پورا قرآن سمجھنے، سمجھانے کی فکر میں لگ جاتے ہیں یقیناً سارا قرآن، ساری " انسانیت " کی ہدایت کے لیئے ہے، لیکن، ہر انسان " کے لئے " سارا قرآن " اُسی طرح نہیں ہے جس طرح کرۂ ارض کا " سارا رزق " " ساری انسانیت " کے لئے ہے، لیکن " ہر انسان " کے لئے نہیں، اگر ہر آدمی " خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا " کے تحت سارے آدمیوں کا کیا دُوجا کا حصہ بھی، ہوس میں اگر کھا جائے تو اکثر صورتوں میں بدہضمی اور بعض میں ہلاکت یقینی ہے ——————— "

(میری محسن کتابیں صفحہ ۲۶)

ایسے طریقِ تفسیر سے دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں تفسیر کے باوجود عوام کے لئے ویسی ہی معمہ رہ جاتی ہیں جیسی پہلے سے تھیں نیز اگر ایک انسان چاہے کہ کسی عنوان پر، پورے قرآن کا سرمایہ، اکھٹا سامنے لاکر، کوئی قطعی رائے قائم کرے تو جس طرح خود قرآن اُس کے لئے اِس وقت ہے اسی طرح وہ تفاسیر بھی، بے کار ثابت ہوں گی اور ہیں، جو قرآن سمجھانے کے لئے اب تک لکھی گئی

ہیں۔ اس قدیم اندازِ تفسیر کو سب سے پہلے علامہ حافظ اسلم جیراجپوری نے اِس زمانے کے لئے ناکافی اور "غیر مفید" بتایا۔ چنانچہ دورِ حاضر میں صرف علامہ غلام احمد پرویز وہ فردِ واحد ہیں جنہوں نے اس طرف توجہ کی اور اپنی "تفسیر" عنوان متعین کر کے لکھنی شروع کی ہے "معارف القرآن" ساڑھے تیرہ سو برس کے لٹریچر میں وہ "واحد تفسیر" ہے۔ جو ہر عنوان کے تحت، تمام آیات قرآنی کو سامنے لاکر، لوگوں کے ایک فیصلہ کن نتیجے پر پہونچنے کے لئے پورا سرمایۂ فکر بہم پہنچاتی ہے۔ بلاشبہ جب تک کسی مسئلہ کا سارا قرآنی مواد اکٹھا نظر کے سامنے نہ ہو، انسان کوئی رائے قائم کرنے اور کسی مسئلہ کو وحیٔ الٰہی کے ذریعہ سمجھنے سے قاصر رہے گا،

تیسری بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ "مفسرین" خدا کی کتاب کو انسانوں کی کتاب کے ماتحت رکھ کر، لوگوں کو سمجھاتے رہے ہیں۔ اس امر کی کوشش ہی نہیں کی گئی کہ قرآن کو خود قرآن ہی سے سمجھائیں اور اللہ کی کتاب کو انسانی کتابوں سے الگ رکھیں —— اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن پر غیر قرآنی لٹریچر کی تہیں بیٹھنا شروع ہو گئیں اور بیٹھتی ہی چلی گئیں تاآنکہ آج حال یہ ہے کہ قرآن بے پناہ تاریک پردوں میں چھپ اور دب گیا ہے، اگر امریکہ کے نامور مفکر "رابرٹ مونٹیین" نے یہ محسوس کیا اور برملا کہہ دیا تو تعجب خیز اور حیرت انگیز نہیں کہ:۔

"اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ضروری ہے کہ قرآنی اقدار کا از سرِ نو تعین کیا جائے، لیکن قرآنی اقدار کا از سرِ نو تعین، اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ "قرآن" کو "روایات" کی گرفت سے آزاد نہ کرایا جائے۔ "قرآن، ایک لعلِ گرانمایہ ہے

مگر وہ "روایات" کی قدیم اور مبہم زبان کے نیچے، بُری طرح دَب کر رہ گیا ہے۔"

(امریکن رسالہ "اُمورِ خارجہ" بابتہ جولائی ۱۹۵۲ء)

خود ہمارے حضرت علامہ ابوالکلام آزاد کا بھی یہی خیال ہے کہ :۔

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کو اُس کی حقیقی شکل و نوعیت میں دیکھیں تو ضروری ہے کہ پہلے وہ تمام پردے ہٹائیں، جو مختلف گوشوں کے خارجی موثرات نے، اس کے چہرے پر ڈال دیئے ہیں، پھر آگے بڑھیں اور قرآن کی حقیقت، خود قرآن ہی کے صفحوں میں تلاش کریں۔" (ترجمان القرآن، جلد ۱ صفحہ ۱۰)

اور علامہ عبدالباری ندوی تو خفا ہی ہیں کہ :۔

" غم و غصہ دونوں، زیادہ مسلمانوں کے حال پر آتا ہے جو اس "زندہ کتاب" پر "ایمان" کا دعویٰ رکھتے ہیں اور پھر زندگی کا راستہ دوسروں سے پوچھتے اور "اِدھر اُدھر" ڈھونڈتے پھرتے ہیں، اُن کو تو "صرف" اس کی ضرورت تھی کہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں "بس اسی کتاب" کو بطور ایک زندہ کتاب کے استعمال کرتے۔" (صفحہ ۲۵)

کسی نے خوب کہا ہے:۔

طالب لعل و گہر نیست، وگرنہ خورشید
ہمچناں در عمل معدن دکان ست کہ بود

بلاشبہ بقول علامہ عبدالباری کوئی اِدھر اُدھر " سے سمجھنا چاہے گا تو ، اُس کی وہ روشنی بھی زائل ہو جائے گی ، جو خود قرآن سے ملی ہو گی ، اور اس کے علم و دماغ پر محض تاریکی ہی تاریکی چھا جائے گی ، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ " قرآن " کو خود قرآن اور صرف قرآن سے ہی سمجھا جائے ، اور " تفاسیر " و " روایات " کے مطابق نہیں بلکہ عقل و علم کی روشنی میں اُس پر غور کیا جائے یہ سمجھنا کہ " قران فہمی " یا " عقل و علم کی بصیرت " متقدمین پر ختم ہو گئی ، اور اب " قرآن " کو اُن ہی " روایات " و " تفاسیر " سے ہمیشہ سمجھتے رہنا چاہیے ، صحیح نہیں ۔ مشہور اسلامی مورخ ۔ علامہ شبلی نعمانی نے " الغزالی " صفحہ ۲۰ پر لکھا ہے کہ خراسان کے پایۂ تخت طوس کے اکابر علماء نے ، جب " حجۃ الاسلام " امام غزالیؒ سے سوال کیا کہ :۔

" آپ مذہب میں کس کے مقلد ہیں ؟ ـــــــــ "

تو حجۃ الاسلام " نے فوراً جواب دیا :۔

" عقلیات میں عقل کا اور منقولات میں قرآن کا ـــــــــ "

حقیقت یہ ہے کہ " قرآن " کو صرف ذاتی غور و فکر اور اپنی ہی عقل و علم کی روشنی میں سمجھنا ، دعوتِ قرآن بھی ہے :۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ " اس میں تو اُن ہی کے لئے اسباق ہیں جو عقل والے ہیں "
(نحل ۹)

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ " اس میں تو اُن ہی کیلئے اسباق ہیں جو غور و فکر کرنیوالے ہیں "
(نحل ۹)

اسلام نے جو بے مثل اور یگانۂ روزگار " تصوّرِ حیات " (Idealogy) " بنی نوعِ انسان " کے سامنے پیش کیا ہے، اُس کا سنگِ بنیاد "آزادی" اور صرف " آزادی " ہے ۔ اعضاء و جوارح کی آزادی ، دل و دماغ کی آزادی، عقل و تدبر کی آزادی ، فکر و خیال کی آزادی ، تصوّرات و معتقدات کی آزادی ، یہاں تک کہ جسم کی بھی آزادی ۔ قرآن نے انسان کو ہر قسم کی " غلامی " سے مطلقاً "آزادی" عطا کر دی ہے ۔ اور کہہ دیا ہے کہ " انسان " بجز " خدا " کے کسی بھی " انسان " کا " غلام " نہیں ہو سکتا اور اُس پر سوائے " وحیِ الٰہی " کے اور کسی انسانی فکر کی " پابندی " نہیں ہے :۔

پیشِ فرعونے ، سرش افگندہ نیست
ما سوی اللہ را مسلماں بندہ نیست

(اقبال)

بقول امام الہند حضرت ابو الکلام آزاد :۔

" مومن " نہ بادشاہوں کی غلامی کیلئے ہے نہ کاہنوں کی اطاعت کیلئے اور نہ کسی اور انسانی طاقت کے آگے جھکنے کیلئے ۔ بلکہ اس کے سر کے لئے ایک ہی چوکھٹ اس کے دل کیلئے ایک ہی عشق، اس کے پاؤں کیلئے ایک ہی زنجیر اور اس کی گردن کیلئے ایک ہی طوقِ اطاعت ہے اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (یوسف) حکم چلانا کسی کیلئے نہیں ہے سوائے اللہ کے "

اللہ کا شکر ہے کہ اب ہر مکتبۂ فکر سے اس طرح کی دعوتیں عوام کے سامنے آ رہی ہیں کہ " قرآن " اپنی جگہ پر مکمل ہے، اور کسی دوسری کتاب کا محتاج نہیں ۔ دار العلوم (دیوبند) کا آرگن " دار العلوم " رقمطراز ہے :۔

"بقاء و ترقی اور تعمیر و تنظیم کی سب سے پہلی اور سب سے آخری منزل، مسلمانوں کے لئے "قرآن" کی تعلیم کو رائج کرنا اور اسکی طرف دنیا کو دعوت دینا ہے، امام مالک[1] نے اس بارہ میں اصل حقیقت سے پردہ اٹھا دیا ہے، فرمایا ہے :۔

لَا يَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا

"اس امت کے آخر طبقہ کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہوسکتی ہے جس سے امت کے اول طبقہ کی اصلاح ہوئی (اور وہ بلاشبہ قرآن ہے)"

پس اگر اس دورِ لادینیت میں مسلم قوم کو اپنے حال اور مستقبل کی طرف سے مطمئن ہونا ہے تو رسوم سے بالاتر ہو کر وہ اس لٹریچر کو سنبھالے جس نے ابتداً اسے جنم دیا تھا۔ اور جو ماضی میں اس کی تشکیل اور تنظیم کا بے خطا معیار ثابت ہوا ہے یعنی "القرآن العظیم"۔ (دار العلوم جلد ۲ شمارہ ۱۰)

اسی طرح "ندوۃ المصنفین" (دہلی) کا آرگن "برہان" لکھتا ہے :۔

"قرآن پاک ایک قطعی اور یقینی چیز ہے اور اس کے معانی و مطالب بیّن اور روشن ہیں اور یہ اپنے دعویٰ و مدعا اور برہان و

[1] امام مالک (وفات ۱۷۹ھ) جنھوں نے "روایات" کا سب سے پہلا مجموعہ "موطا" کے نام سے مرتب کیا تھا

دلیل میں محکم و مستحکم ہے، نیز یہ کتاب اپنے مقصود و مدعا کیلئے کافی و وافی ہے، اور اُس کا مطلب بغیر "روایات" و "اخبار" اور "احادیث" و "آثار" کے ملائے، خود اُس سے ہی بخوبی سمجھ میں آتا اور آسکتا ہے، جو اپنے مفہوم کے اظہار میں کسی خارجی ضمیمہ اور بیرونی مدد کا محتاج نہیں اور اُس کا مقصود و مدعا اور مفہوم و مطلب، ترجمہ و معانی اپنی ذات میں کامل اور مکمل و مفید ہیں، ناقص و ناتمام، نامکمل و غیر مفید یا کسی دوسری چیز پر موقوف نہیں" (برہان جلد ۲۴ شمارہ ۳)

لہذا کسی فردِ بشر پر یہ پابندی عائد نہیں کی جا سکتی کہ وہ "قرآن" کو دوسروں ہی کی پرفانی آنکھ سے پڑھے اور دوسروں ہی کی پرفانی عقل سے سمجھے ــــ "قرآن" ہر فردِ بشر کے لئے یکساں سرچشمہ ہدایت بن کر نازل ہوا ہے لہذا اُس کو ہر شخص کو اپنے ہی طور پر، اپنی ہی عقل و علم کی روشنی میں پڑھنا اور اُس پر اپنے ہی طور پر غور و فکر کرنا چاہیئے، کیونکہ ہر شخص اپنے اعمال و افکار کا آپ ہی ذمّے دار ہے :۔

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی ۔ (نجم ۳) "ہرگز کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا ہر شخص کو صرف اپنی ہی کمائی ملیگی اور یہ کہ ہر شخص کی ذاتی کوشش ہی دیکھی جائیگی اور پھر اُسی کا اس کو بدلہ دیا جائیگا"

زیرِ نظر کتاب کو، پیش کرنے کا مقصد، یہ تو خیر ہے ہی کہ میں "قرآن" کی

بعض اُن چیزوں کے متعلق، جو ساڑھے تیرہ سو برس سے اب تک لاینحل اور بدستور ناقابلِ فہم، بنی ہوئی ہیں، کوئی قطعی رائے پیش کر کے، اہلِ علم و بصیرت اور صاحبانِ فکر و نظر کو دعوتِ تدبّر و تفکّر دوں۔ مگر یہ بھی میرا بنیادی مقصد ہے کہ مُسلم نوجوانوں کو یہ دکھاؤں اور بتاؤں کہ تیلی کے بیل کی طرح، آنکھیں بند کر کے کولھو کے گرد گھومنا، شرفِ انسانیت نہیں بلکہ طرزِ حیوانیت ہے لہذا آپ خود "قرآن" کو اپنی عقل و فکر کا مرکز بنائیے۔ اور یہ جان لیجیے کہ "قرآن فہمی" نہ اگلوں پر ختم ہوگئی ہے اور نہ کبھی کسی فردِ واحد یا کسی مخصوص جماعت پر، ختم ہوگی۔ زیرِ نظر کتاب ہی اِس حقیقت پر شاہدِ عادل ہے کہ ہزاروں ہزار "تفاسیر" کی تصنیف اور ایک عظیم دفترِ "روایات" کی تدوین کے بعد بھی، قرآن کے کتنے مقامات ایسے ہیں جن کا مفہوم ہنوز متعیّن نہ ہو سکا ہے اور جس طرح تیسری صدی ہجری میں "قرآن" کی ہر ہر سطر، عقل و فکر کی جولانیوں کا، لامتناہی میدان بنی ہوئی تھی، آج بھی بدستور ویسی ہی مجسّم دعوتِ فکر و نظر بنی ہوئی ہے، لہذا ہمارے مُسلم نوجوان، مرعوبیت کو دُور کر کے "قرآن" کو علمی اور فکری جدّ و جہد کا مرکز بنا کر، وہ انقلاب پیدا کریں جو دنیا میں زندہ قوموں کا طُرّۂ امتیاز اور خود "قرآن" کی عام دعوت ہے، بقول اقبال "صد جہاں باقیست در قرآں ہنوز" لہذا:۔

اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ "میں تمہیں صرف ایک ہی نصیحت کرتا
تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ہوں وہ یہ کہ تم دو دو ایک ایک ہی سہی مگر
ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (سبا ۶) اٹھ کھڑے ہو اور غور و فکر شروع کر دو"

عطاء اللہ پالوی، کریم چک، چھرہ۔ یکم جنوری سنہ ۱۹۵۶ء

هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ ۞ (یوسف ۱۲)

(میرا طریقہ یہی ہے کہ میں خدا کی کتاب کی طرف علی وجہہ البصیرت، دعوت دیتا ہوں)

فہرست

"طلسمِ گنبدِ گردوں" کو توڑ سکتے ہیں
"زجاج" کی یہ عمارت ہے سنگِ خارا نہیں

(اقبال)

اَنزَلنَآ اِلَیکَ الذِّکرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیھِم وَلَعَلَّھُم یَتَفَکَّرُوْنَ

(نحل ٦)

(ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نازل کیا کہ لوگوں کیلیے جو کچھ اتارا گیا ہے اس کو تم اُن سے بیان کر دو اور تاکہ وہ لوگ اس پر غور و فکر کیا کریں)۔

"سَجدہ" و "شَجرہ"

("آدم" کے قصّے میں)

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

اقبال

اللہ تعالیٰ نے کہا کہ سوائے میرے کسی اور کی عبادت نہ کرو پھر آدم کی تخلیق کے بعد ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، اور ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اُس کو ملعون قرار دیا۔

یہ کیوں — ؟

اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اے آدم " لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ " " اس "درخت" کے قریب نہ جانا یہ تمہارے لئے " ممنوع " ہے، آدم " جنّت " میں تھے اور جنّت کے ذکر میں ہے کہ :-
" فَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ " یعنی جنّت میں کثرت سے میوے ہیں، جو نہ تو کبھی ختم ہونے والے ہیں اور نہ ان میں سے کوئی " ممنوع " ہے۔

یہ کیا — ؟ —

اس مقالہ میں اسی عنوان پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

"سجدہ" و "شجرہ"

"آدم" کی "خلافت" و "نبوت" سے متعلق میں اپنی کتاب، "مآلِ بصیرت" میں اپنی رائے ظاہر کر چکا ہوں، زیرِ نظر سطور میں "سجدہ" و "شجرہ" کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے :-

جب "آدم" کی تخلیق ہو چکی تو "ملائکہ" کو حکم ہوا کہ وہ "آدم" کو "سجدہ" کریں، چنانچہ انھوں نے "سجدہ" کیا، مگر "ابلیس" نے انکار کر دیا :-

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوٓا إِلَّآ إِبْلِيسَ ط

"اور جب کہ ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے جو کہ جنات میں سے تھا اس نے اپنے رب کی عدول حکمی کی"

(بقرہ ۴ و کہف ۷)

اس سلسلے میں دو چیز، لوگوں کو پریشان کئے ہوئے ہے :-

(۱) ایک یہ کہ ملائکہ نے کیوں سجدہ کیا ؟

(۲) دوسرے یہ کہ ابلیس نے کیوں سجدہ نہیں کیا ؟

یعنی یہ کہ جب "سجدہ" خدا کے سوا دوسرے کے لئے جائز ہی نہیں ہے تو اللہ تعالےٰ نے "ملائکہ" سے "آدم" کو "سجدہ" کیوں کرایا اور "ملائکہ" نے کیسے سجدہ کیا ؟ دوم یہ کہ سجدہ کا حکم "ملائکہ" کو ہوا تھا۔ پھر "ابلیس"

اس حکم میں کیوں شامل قرار دیا گیا ؟ اور " ابلیس " نے بھی پرسش سجدہ کے وقت یہ معقول جواب کیوں نہ دیا کہ میں " ملائکہ " میں سے نہیں ہوں اور آپ نے سجدہ کا حکم صرف " ملائکہ " کو دیا تھا ؟ ۔

قصہ آدم میں یہ اور پیچیدگیاں (مشکلات) اس لئے پیدا ہو گئی ہیں کہ " ملائکہ " اور " سجدہ " دونوں کا مفہوم قرار واقعی متعین نہیں کیا گیا ، آدم کے قصہ میں " ملائکہ " کے معنی " فرشتے " نہیں ، بلکہ یہاں " ملائکہ " سے مراد کائنات کی وہ " طاقتیں " ہیں جو کائنات میں موجود اور اس کے تمام اسباب و علل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں ۔ بالفاظ دیگر اقصائے عالم میں خدا کے مقررہ احکام اور متعین قوانین کو چلانے والی تمام مخلوق یا طاقتوں کو ایک جامع لفظ " ملائکہ " سے تعبیر کیا گیا ہے :۔

(۱) وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِہٖ " اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ آسمان و زمین اس کے " امر سے قائم ہیں " (روم ۳)

(۲) یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ " وہ آسمان سے لے کر زمین تک " تدبیر امور " کرتا ہے " (سجدہ ۱)

یہ " تدابیر امور " جن ذرائع و وسائط اور قوت و مخلوق کے ذریعہ عمل میں آتی ہیں ، ان کا سلسلہ آسمان سے زمین تک قائم ہے ! ۔

" ملائکہ " اور " ملکوت " جمع ہے ملک (بمعنی فرشتہ) کی بھی ، اور مالک (بمعنی طاقت والا) کی بھی ۔ قصۂ آدم میں لفظ " ملائکہ " سے مراد " فرشتے " نہیں بلکہ کائنات کی تمام طاقتیں ہیں ۔۔۔ جن میں دیگر تمام مخلوق اور طاقتوں کے ساتھ جنات بھی شامل ہیں ۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو " ملکوت " دکھانے کا ذکر کیا ہے :۔

نُرِیٓ اِبْرٰهِیْمَ مَلَکُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ (انعام ۹) دکھائے ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے ملکوت ۔

آگے حضرت ابراہیم ؑ کے "فرشتے" نہیں بلکہ سورج، چاند اور ستارے دیکھنے کا ذکر ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہاں "ملکوت" سے مراد "فرشتے" نہیں بلکہ "کائنات کی تمام طاقتیں" ہیں ۔ اور ہرگز، قصۂ آدم میں "ملائکہ" بمعنی "فرشتے" نہیں آیا ہے اس سے بھی زیادہ صاف آیت ملاحظہ ہو:۔

وَیَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِیَّاكُمْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ط (سبا ۵) اور جس دن وہ سب کو اکٹھا کرے گا ملائکہ سے پوچھے گا کہ کیا لوگ تمہاری پرستش کرتے تھے ؟"

یہاں بھی ملائکہ بمعنی طاقتوں استعمال ہوا ہے ۔ لوگ فرشتوں کی نہیں بلکہ طاقتوں (ہوا، پانی، آگ وغیرہ) کی پرستش کرتے ہیں غرض یہ کہ "ملائکہ" میں "تمام طاقتیں" شامل و داخل ہیں، خواہ وہ مادی جسم رکھتی ہوں یا نہ رکھتی ہوں، چاہے وہ ہم کو نظر آتی ہوں یا نہ نظر آتی ہوں۔ چونکہ یہ "طاقتیں" خدائی قانون کے مطابق، عمل پیرا ہیں اس لئے اُن کی کار فرمائیوں کو "تسبیح" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے :۔

(۱) وَالْمَلٰٓئِكَةُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (شوریٰ ۱) "اور ملائکہ حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں "

(۲) وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ (انبیاء ۲) " اور وہ اس کے امر پر عمل کرتے رہتے ہیں "

(۳) لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ۔ (تحریم ۱) "اللہ اُن کو جس بات کا امر کرتا ہے وہ اُس میں اُس کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہ وہی کرتے ہیں جس کا ان کو امر کیا جاتا ہے "

کائنات کی جس طاقت کے ذمہ جو فرض ہے وہ اس فرض کو ادا کر رہی ہے۔ یہی سجدہ ہے۔ "فرشتے" نہ تو جسم رکھتے ہیں۔ کہ ہماری طرح سر جھکائیں اور نہ وہ کسی انسان کے محکوم کبھی بنے۔ پھر فرشتوں نے کیا سجدہ کیا؟۔ دراصل ملائکہ سے مراد کائنات کی طاقتیں ہیں۔ "رعد" (کڑک) کے ساتھ کہیں "برق" (بجلی) آیا ہے اور کہیں "ملائکہ" (دوسری طاقتیں)

(۱) وَرَعْدٌ وَّ بَرْقٌ (بقرہ ۲) "اور کڑک اور بجلی"

(۲) وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ (رعد ۲) "اور کڑک اور دوسری طاقتیں اسکی تسبیح و حمد میں ہیں"

رعد کے ساتھ "فرشتے" کی کوئی تک نہیں ہے۔ یہاں بھی "ملائکہ" سے مراد رعد کی طرح کائنات کی دوسری طاقتیں ہیں۔

"آدم" نے جس وقت "علم الاسماء" کا مظاہرہ کیا تو "ملائکہ" نے فوراً اعتراف کر لیا کہ وہ اس بارے میں مطلقاً کچھ نہیں جانتے، اسی لئے جب بربنائے شرفِ علم "ملائکہ" کو کہا گیا کہ وہ "آدم" کو "سجدہ" کریں تو، بہ استثنائے ابلیس، انھوں نے "آدم" کو اپنے سے افضل و بہتر ماننے کے سبب ان کے سامنے سر جھکا دیا، اس سے مراد "جنات" کے سوا کائنات کی تمام "قوتوں" کا انسان کی علمی طاقت و عظمت کے سامنے جھکنا ہے۔ "ملائکہ" کوئی "مادی جسم" نہیں رکھتے کہ وہ انسانوں کی طرح زمین پر اپنی "پیشانی" ٹیک کر "سجدہ" کریں۔ ملائکہ نے "آدم" کو "سجدہ" کیا تو اس طرح نہیں جس طرح ہم انسان اپنی پیشانی زمین پر ٹیک کر سجدہ کرتے ہیں بھلا جب اُن کو "جسم" ہی نہیں تو "پیشانی" کہاں، جس کو "ملائکہ" زمین پر ٹیکتے؟ اور جب انھوں نے پیشانی

ٹیک کر ہماری طرح " سجدہ " کیا ہی نہیں تو اُن کے " سجدہ " کو ہم اپنے " سجدہ " کی طرح کی چیز سمجھ کر، متفکر، پریشان اور حیرت زدہ کیوں ہوں ؟ " ملائکہ " کے "سجدہ" سے مراد صرف یہ ہے کہ "انسان " کی علمی عظمت وطاقت کے سامنے " کائنات " کی تمام مادّی وغیر مادّی قوتیں " جھک گئیں اور انھوں نے اظہارِ اطاعت وانقیاد اور عجز وانکسار کیا " اظہار اطاعت وانقیاد " اور " نمائشِ تسلیم ورضا " کے لئے " سر بسجود " کی اصطلاح تو اس قدر عام ہے کہ ہر شخص اس سے واقف ہے ۔ ذرا ان دونوں آیات کو دیکھئے نا :۔

لَہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا ۔ (آل عمران ۹)

" آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہیں سب طوعاً وکرھاً خدا کے " تابع فرمان" ہیں "

لِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا (رعد ۲)

" آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہیں سب طوعاً وکرھاً اللہ کو " سجدہ " کرتے ہیں ۔"

اِن دونوں آیتوں کو دیکھئے " اَسْلَمَ " اور " یَسْجُدُ " کے سوا اور کوئی فرق نہیں ہے ، اس کے معنی یہ ہیں کہ " اسلم " اور " یسجد " دونوں مرادف الفاظ ہیں اور " تابع فرمان " کے معنی " سجدہ " اور " سجدہ " کے معنی " تابع فرمان " کے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ دونوں کا مفہوم بجز اطاعت وفرماں برداری کے اور کچھ نہیں ہے ۔ اسی طرح یہ دونوں ، آیتیں دیکھئے :۔

لِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ " آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہیں وَمَا فِی الْاَرْضِ ۔ (نحل ۶) سب اللہ کو " سجدہ " کرتے ہیں "، تُسَبِّحُ لَہُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ " ساتوں آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی وَالْاَرْضُ ۔ (بنی اسرائیل ۵) ہیں سب اللہ کی " تسبیح " کرتے ہیں "

یعنی " تسبیح " اور " سجدہ " مرادف الفاظ ہیں، اس طور پر ظاہر ہوا کہ " تسبیح " یا " سجدہ " یا " تسلیم " سب کا مفہوم ایک اور صرف ایک ہے، یعنی اظہارِ اطاعت گزاری و فرماں برداری اور تسلیم و رضا کا نام " سجدہ و تسبیح " ہے۔ ایسی صورت میں " سجدہ " کے معنی زمین پر پیشانی ٹیکنا کیسے ہوگا، جو یہ سمجھا جائے کہ " ملائکہ " نے زمین پر پیشانی ٹیک کر " آدم " کو " سجدہ " کیا تھا ؟ ۔ چونکہ ہم مسلمان درحقیقت خود، تسلیم و رضا اور اطاعت و انقیاد کی نیّت سے تو " سجدہ " کرتے نہیں، بلکہ ایک رسم ادا کرتے ہیں لہذا " سجدہ " کا صحیح مفہوم ہی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے اور ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ لفظ " سجدہ " جہاں بھی آئے اُس کے معنی ہوں گے زمین پر پیشانی ٹیکنا، اور اس لئے جب اور جہاں کہیں اظہارِ اطاعت و انقیاد کے لئے لفظ " سجدہ " آتا ہے، تو ہم پریشان ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ پیشانی زمین پر تو صرف خدا کے سامنے ٹیکی جاتی ہے ۔ پھر یہاں یہ پیشانی ٹیکنے کا کیسے ذکر آگیا؟ حالانکہ " سجدہ " کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ پیشانی زمین پر ٹیکی جائے بلکہ صرف یہ ہے کہ اظہارِ اطاعت و انقیاد کیا جائے ۔ اب چاہے اس کی نوعیت جو بھی ہو ۔ جون سی بھی شکل و صورت ہو، اور جو بھی صورتِ اظہارِ اطاعت و

انقیاد کی ہوگی اُس کو " سجدہ " کہا جائے گا۔ " قرآن " نے متعدد نہیں بلکہ بلا استثناء ہر جگہ محض اظہارِ اطاعت و فرماں برداری اور تسلیم و رضا کے لئے لفظ " سجدہ " استعمال کیا ہے، اور اس کا مفہوم ہرگز زمین پر پیشانی ٹیکنا نہیں ہے، وہ تو اظہارِ اطاعت کی محض ایک شکل ہے، مثلاً :-

(۱) اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ " کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ جو کچھ آسمانوں
مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی اور زمین میں ہیں اور سورج اور چاند
الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ اور ستارے اور پہاڑ اور درخت
وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ اور چوپائے سب کے سب ہی اللہ
وَالدَّوَابُّ (حج ۲) کے سامنے سجدہ ریز ہیں ؟ "

(۲) وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ " اور پودے اور درخت، سب
یَسْجُدَانِ (رحمٰن ۱) کے سب سجدے میں لگے ہوئے ہیں "

ارض و سموات میں، شمس، قمر، نجوم، جبال، شجر، نجم، دوآب یا کوئی بھی دوسری مادی و غیر مادی مخلوق ایسی نہیں ہے جو انسان کا سا جسم رکھتی ہو اور اس کے سر میں پیشانی بھی ہو اور وہ زمین پر پیشانی ٹیک کر سجدہ کرتی ہو، اور اللہ کہتا ہے کہ ان تمام چیزوں کو ـــــ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ اللہ کو سجدہ کرتی ہیں ؟ ـــــ اب بتایئے کہ ان میں سے کسی کو، آپ نے زمین پر پیشانی ٹیک کر " سجدہ " کرتے آج تک دیکھا ہے ؟ پھر آپ " ملائکہ " کے بارے میں یہ کیوں سوچتے ہیں کہ انھوں نے " آدم " کے سامنے پیشانی ٹیک کر " سجدہ " کیا تھا ؟ ۔ اور آپ کو یہ کیوں حیرانی ہوتی ہے کہ " سجدہ "

تو خدا کے سوا دوسرے کو جائز نہیں پھر ملائکہ " سے آدمؑ کو کیوں " سجدہ " کرایا گیا ؟ اور ملائکہ " نے کیوں " سجدہ " کیا ؟ ۔

" ملائکہ " نے آدمؑ کو اسی طرح " سجدہ " کیا تھا ، جس طرح کائنات کی ساری چیزیں خدا کو ہر وقت " سجدہ " کرتی رہتی ہیں اور آپ کو دکھائی گئی ہیں۔ یعنی " ملائکہ " نے " آدمؑ " کے سامنے اظہارِ اطاعت و انقیاد کیا تھا چنانچہ آج دیکھ لیجئے کہ ہوا ، پانی ، جانور غرض ساری چیزیں " انسان " کی مطیع و منقاد بنی ہوئی ہیں ۔ اور " انسان " ان سے جو کام ، جس طرح سے لینا چاہتا ہے ، وہ انجام دیتی ہیں یہی " ملائکہ " کا " آدمؑ " کو " سجدہ " کرنا تھا لہٰذا قصّہ آدم میں " ملائکہ " سے مُراد کائنات کی ساری " قوتیں " ہیں اور جس طرح ساری طاقتور مخلوق کے نمائندے " آدمؑ " کے سامنے تھے اسی طرح " جنوں " کا نمائندہ " ابلیس " بھی ایک " طاقت " تھا ۔ اور جب " ملائکہ " یعنی ساری " طاقتوں " کو " آدمؑ " کا مطیع و منقاد بننے کو کہا گیا تو " جنوں " کا نمائندہ " ابلیس " بھی اس حکم میں داخل تھا " ابلیس " کے جواب سے بھی ظاہر ہے کہ وہ اُصولی طور پر اپنے کو بھی " ملائکہ " میں داخل اور اس حکم میں شامل سمجھتا تھا۔ ورنہ پرسشِ سجدہ کے وقت دھڑسے کہہ دیتا کہ میں " ملائکہ " میں سے نہیں ہوں ۔

رہا یہ کہ " جنوں " کے نمائندہ " ابلیس " نے انکار کیوں کیا ؟ سو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عجز و انکسار اور اطاعت و انقیاد کا اظہار ہمیشہ اپنے سے افضل و برتر کے سامنے کیا جاتا ہے اپنے سے کمتر کے سامنے کوئی بھی سرِ تسلیم خم نہیں کرتا

" آدم " کو " ابلیس " نے بربنائے عناصر ترکیبی اپنے سے بہتر نہیں مانا۔
اس لئے اُس نے اظہارِ اطاعت سے انکار کر دیا۔

جس حد تک علمی فضیلت کا تعلّق ہے " جنوں " سے بھی " انسان " افضل ہے، اسی لئے، جنّات کے نمائندے " ابلیس " نے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا، بلکہ " ابلیس " نے دوسرا پہلو اختیار کیا، معیارِ فضیلت اُس نے " علم " کو نہیں بلکہ " عناصر ترکیبی " کو قرار دیا، اُس کا دعویٰ یہ تھا کہ :-

(۱) اَنَاْ خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ " میں آدم سے بہتر ہوں اس لئے کہ آپ
وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ؕ نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو
مٹّی سے پیدا کیا ہے "
(اعراف ۲)

(۲) ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ؕ " کیا میں اس کے سامنے جھکوں جسے تو نے
قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ مٹّی سے پیدا کیا ہو؟ وہ کہنے لگا کہ دیکھ تو یہی
كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۔ (بنی اسرائیل ۷) کیا یہی وہ ہو جس کو تو نے مجھ پر فضیلت دیدی ہو؟

چونکہ ابلیس " نے " آدم " کو بربنائے عناصر ترکیبی، اپنے سے افضل و برتر نہیں تسلیم کیا اس لئے اُس نے " آدم " کے سامنے جھکنے، اُن کی اطاعت قبول کرنے اور اُن کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ دیکھ لیجیے کہ اگرچہ ارض و سماء کی تمام مخلوق اور ساری مہیب و عظیم " طاقتیں " انسان کی علمی و عقلی طاقت کے سامنے سربسجود ہیں مگر " شیطانی قوت " یعنی " جنّی مخلوق " پر " انسان " کا کچھ قابو نہیں چلتا۔ شجر و حجر آب و آتش، خاک و باد سب پر " انسان " کو[1]

---

[1] اس عنوان پر تفصیلی گفت گو مقالہ کے آخر میں ملاحظہ فرمائیے گا۔

قبضۂ اقتدار حاصل ہے مگر وہ مخلوق جس کو "جنّ" کہا جاتا ہے، انسان کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہے، ہم دور بینوں سے، ننھے ننھے "جرمس" کا بھی معائنہ کر لیتے ہیں مگر "جنّ"، کو ہم کبھی نہیں دیکھ پاتے :-

اِنَّہٗ یَرٰىکُمْ ھُوَ وَقَبِیْلُہٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَھُمْ "شیطٰن اور اس کے قبیلے تم کو اس طور پر دیکھتے ہیں کہ تم اُن کو نہیں دیکھتے ہو" (اعراف ۳)

"قصّۂ آدم" کی دوسری چیز جواب تک بالکل ہی معمہ اور ہنوز لاینحل بنی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جب "آدم" کی تخلیق عمل میں آگئی تو "ملائکہ" کے مسجود ہونے کا شرف عطا کر کے، اُنھیں مزید عنایات سے سرفراز کیا گیا :-

(۱) قُلْنَا یٰاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ وَکُلَا مِنْھَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا (بقرہ ۴) "ہم نے کہا کہ اے آدم! تم اور تمھاری بیوی جنّت میں رہو اور جہاں سے جو دل میں آوے کھاؤ پیو۔"

(۲) اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْھَا وَلَا تَعْرٰی وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْھَا وَلَا تَضْحٰی۔ (طٰہٰ ۷) "یہاں تمہارے لئے یہ ہو کہ یہاں تم نہ کبھی بھوکے ہوگے نہ ننگے، نہ یہاں تم کو پیاس کی شدّت ستائیگی۔ اور نہ تم دھوپ کی تمازت سے تیوراؤ گے"

مگر ساتھ ہی ساتھ ایک "ممانعت" بھی کی گئی۔ یعنی یہ کہ دونوں "میاں بیوی" جو چاہو اور جہاں سے چاہو کھاؤ پیو مگر :-

وَلَا تَقْرَبَا ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ فَتَکُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ہ "اور ہاں دیکھو! یہ جو شجرہ ہے نا، اس سے قربت نہ کرنا ورنہ تم ظٰلمین میں سے ہو جاؤ گے" (بقرہ ۴ و اعراف ۲)

سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس سے ان دونوں "مرد و عورت" کو روکا گیا تھا ؟ " ھٰذِہٖ " کہنے سے ظاہر ہے کہ جس چیز کی جانب اشارۂ قریب کیا گیا تھا وہ چیز اُن دونوں سے دُور اور الگ نہ تھی، جو چیز بالکل قریب اور سامنے کی ہو اُسی کی طرف " ھٰذِہٖ " کر کے اشارہ کیا جاتا ہے۔ " ھٰذا " " اسم اشارہ " ہے، اس کا مشارٌ الیہ " شجرہ " ہے۔ مگر یہ مشارٌ الیہ خود " اسم نکرہ " ہے، حالانکہ اس کا محل " اسم معرفہ " کا ہے۔ " شجر " تو ہر درخت کو کہتے ہیں۔ کیا " آدم " اور اُن کی بیوی کے لئے " باغ " کے سارے درخت " ممنوع " تھے ؟ پھر یہاں " شجر " تو ہے بھی نہیں بلکہ " شجرہ " کہا گیا ہے۔ لہذا " شجرہ " یہاں " اسم معرفہ " ہُوا " ھٰذِہٖ " اشارۂ قریب ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کہنا کہ :-

ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ " یہ جو شجرہ ہے نا "

جب ہی درست ہو سکتا ہے کہ " شجرہ "۔ جو مشارٌ الیہ ہے وہ ان دونوں کے پاس تھا۔ انھوں نے اشارہ کرتے ہی اس کو سمجھ بھی لیا تھا، وہ چیز ان دونوں سے الگ اور جُدا نہ تھی، پھر جب ان دونوں نے اُس کو سمجھا تھا تو یہ ہماری سمجھ میں بھی ضرور آنا چاہیئے۔ " قرآن " میں دوسرے مقامات پر " ھٰذِہٖ " کے اشارۂ قریب کے ساتھ جو جو باتیں کہی گئی ہیں وہ سب ہماری سمجھ میں بھی بہ خوبی آتی ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو دعاء کی تھی اس میں ہی :-

فِی ھٰذِہِ الدُّنْیَا (اعراف ۱۹) " یہ جو دنیا ہے اس میں بھی "

" ھٰذِہٖ " کے اشارۂ قریب کے بعد جو مشارٌ الیہ " دنیا " ہے اُس سے

حضرت موسیٰ اور اُن کی قوم بھی واقف و متعارف تھی، اور ہم بھی جانتے ہیں کہ " دنیا " کس کو کہتے ہیں، یا حضرت صالح نے قوم سے کہا کہ :-

هٰذِهٖ نَاقَةٌ (شعرا ۸) " یہ جو اونٹنی ہے "

اس کو حضرت صالح کی قوم نے بھی سمجھ لیا تھا کہ " ناقہ " کیا چیز تھی، اور ہم بھی اس جگہ اس آیت کو پڑھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ " ناقہ " سے کیا مراد ہے؟ یا مسلمانوں سے کہا گیا ہے :-

هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ (دھر ۲) " یہ جو نصیحت نامہ ہے "

سب لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سے مراد " قرآن " ہے ـــــ یا حضرت ابراہیمؑ نے " بتکدہ آذری " میں پہونچ کر اپنے باپ اور قوم سے سوال کیا تھا کہ :-

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ (انبیاء ۵) " یہ کیا مورتیاں ہیں "

ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو اشارہ کیا تھا اُس کو آذر، ان کی قوم اور ہم، سب سمجھ جاتے ہیں کہ انھوں نے کسی بُت خانہ کے بُتوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ دوزخیوں سے کہا جائے گا :-

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ (رحمن ۲) " یہ جو جہنم ہے "

اس کو ہم آپ سب ہی سمجھتے ہیں کہ کیا ہے۔ مگر آدم کے معاملہ میں یہ کیا بات ہے کہ ہماری سمجھ اُس کتاب میں کام نہیں کرتی جس کو " النور " (روشنی) اور " کتاب مبین " (کھلی ہوئی واضح، صاف کتاب) کہا گیا ہے؟ جس طرح کا حکم " آدم " اور اُن کی " بیوی " کو دیا گیا تھا، تقریباً ویسا ہی حکم " بنی اسرائیل " کو بھی دیا گیا تھا :-

وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ "اور جب کہ ان سے کہا گیا کہ تم لوگ یہ جو قریہ ہے اس میں رہو اور جہاں سے جو دل چاہے وہ بہ فراغت کھاؤ پیو"

(اعراف ۲۰)

ظاہر ہے کہ "هٰذِهِ" کے اشارہ قریب کے بعد "قریہ" آیا ہے اس سے مخاطبین بھی واقف تھے اور ہم سب بھی باخبر ہیں مگر یہ "آدم" کا "شجرہ" کیوں راز رہا؟ ــ بہرحال! "آدم" اور اُن کی "بیوی" کے ساتھ ساتھ قیام وطعام کے ذکر کے بعد اس کا ذکر آنے سے یہ بات بالکل ہی ظاہر ہو کر رہی ہے کہ یہ کچھ "میاں بیوی" کا ہی معاملہ تھا۔ اور "ظٰلمین" کہہ کر "قربتِ شجرہ" کے جس نقصان کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس خیال کو اور مستحکم کر دیتا ہے۔ اس کو اس قدر تباہ کن بتایا گیا تھا کہ اگر تم نے اس کے خلاف کیا تو اپنے ہاتھوں مصیبت میں پڑ جاؤ گے، اپنے آپ پر ظلم کر لو گے یعنی اس آرام دہ اور مطمئن زندگی سے بہت دُور جا پڑو گے ــ اللہ تعالیٰ کا دعویٰ یہ ہی کہ:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ "تمام تعریفیں اُسی خدا کے لیے ہیں جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کیا اور اس میں کسی طرح کی بھی کوئی پیچیدگی نہیں رکھی"

(کہف ۱)

مگر آج تک مجھے کسی فرقہ اور مکتبۂ خیال کی کسی تفسیر و تحریر میں بھی "هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" سے متعلق، متذکرہ سوال کا معقول، شافی اور قابلِ اطمینان ایسا جواب نہیں ملا ہے جو "قرآن" اور "عقل" اور "واقعہ" سے مطابقت رکھتا ہو ــ

قدیم مفسّرین نے بالعموم اس امر پر اتّفاق کر لیا ہے کہ یہ کوئی "پھلدار درخت" تھا، جس کا "پھل" کھانے کی ممانعت کی گئی تھی، البتہ اس میں سخت اختلاف ہے کہ وہ کون سا درخت تھا؟ تفسیر "بیان السبحان" قدیم تفاسیر کو سامنے رکھ کر لکھی جا رہی ہے، اس کے مصنف اس سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ:-

"محققین علماء کا قول ہے کہ "درخت" کوئی معیّن نہ تھا، بلکہ مُراد یہ تھی کہ اس نوع کے درخت کے پاس نہ جانا "شجرہ" سے مُراد سعید بن جبیر، محمد بن قیس، جادہ بن ہبیرہ اور شعبی و سدّی کے قول کے مطابق درخت "انگور" ہے۔ بعض صحابہ کے نزدیک "گیہوں" کا درخت مراد ہے، مجاہد، قتادہ، ابن جریج وغیرہ کا قول ہے کہ وہ "انجیر" کا درخت تھا۔ بعض لوگوں نے "کھجور" کا درخت بیان کیا ہے" (جلد ۱ صفحہ ۸۹)

کہا جاتا ہے کہ "روایات" قرآن کی شرح ہیں مگر "هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" کی نقاب کشائی سے یہ ذخیرہ بھی عاجز ہے صحیحین کی "شفاعت" والی روایات بھی کچھ نہیں ظاہر کرتیں۔ جن میں ہے کہ آدم قیامت کے دن اپنے اس ذائقۂ شجرہ کی ندامت میں شفاعت سے انکار کر دیں گے۔ بھلا اس سے بہتر کون سا موقع ہو سکتا تھا اس مُبہم مسئلے کی تفسیر کا؟ مگر اِسے نہ آدم نے ظاہر کیا نہ آنحضرت نے۔ بہرکیف! یہ تو عہد قدیم کا حال ہے دورِ جدید کے مفسّرین اور قابلِ ذکر اصحاب کے یہاں بھی، اِس عنوان پر کوئی قطعی اور معقول رائے نہیں ملتی۔ علاّمہ حافظ اسلم جیراجپوری نے "نکاتِ قرآن" میں یا علاّمہ حفیظ الرحمٰن سیوہاروی نے "قصص القرآن" میں یا علاّمہ آزاد نے "ترجمان القرآن" میں، یا سیّد مقبول احمد نے "مظاہرۂ قرآن" میں اس

موضوع کو بحث کے لئے چُنا ہی نہیں۔ یہ وہ "ابن آدم" ہیں جنھوں نے "لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" پر پورا پورا عمل کیا ہے۔ کچھ لوگ وہ ہیں جنھوں نے "ترجمہ" ہی میں ایک فیصلہ کن بات لکھ کر جھگڑا چکا دیا ہے۔ مثلاً ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے زیرِ بحث آیت کا ترجمہ یوں درج کر دیا اور بات ختم ہوگئی:۔

"اور ہم نے (آدم سے) کہا اے آدم! تم اور تمہاری بی بی بہشت میں بسو اور اس میں جہاں کہیں سے تمہارا جی چاہے بافراغت کھاؤ (پیو) مگر اس درخت (گندم) کے پاس مت پھٹکنا (ایسا کرو گے) تو تم (آپ اپنا) نقصان کرو گے۔"

انھوں نے تو خیر "گندم" کو قوسین (براکٹ) میں دیا ہے مگر علامہ ثناء اللہ صاحب نے تو اس جھگڑے کو بھی ختم کر دیا ہے۔ انھوں نے تفسیر ثنائی میں صرف یوں تفسیری ترجمہ کر کے جھگڑا چکا دیا ہے کہ:۔

"اور ہم نے کہا کہ اے آدم! تو اور تیری بیوی حوّا اس باغ جنت میں رہو اور اس میں سے کھُلا جہاں چاہو کھاتے پھرو مگر اس گیہوں[1] کے درخت سے ایسا پرہیز کرلو کہ اس کے قریب بھی نہ جاؤ نہیں تو ظالم ٹھہرو گے"

علامہ فرمان علی صاحب نے نہ تو "ترجمہ" ہی میں کچھ اضافہ کیا ہے اور نہ "حاشیہ" ہی میں کچھ اس پر روشنی ڈالی ہے بلکہ صرف یہ کہہ کر دوسری

لہ دوسرے ایڈیشن میں "گیہوں" کے بجائے لفظ "انجیر" لکھا ہوا ملتا ہے اور دو میں کسی جگہ کوئی نوٹ نہیں ہے کہ یہ تبدیلی کیوں عمل میں آئی؟۔

بحث میں چلے گئے ہیں کہ :۔

"جب خدا نے حضرت آدم کو بہشت میں رہنے کا حکم دیا تھا تو یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ فلاں درخت کے پاس نہ جانا، ورنہ تم اپنا آپ نقصان کرو گے"

دراصل یہ تمام لوگ حافظ ابن کثیر کے خوشہ چیں ہیں۔ اُنھوں نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے :۔

"اس ایک خاص درخت سے روکنا، امتحان تھا، بعض کہتے ہیں کہ یہ انگور کی بیل تھی، کوئی کہتا ہے کہ گیہوں کا درخت تھا، کسی نے سنبلہ کہا ہے کسی نے کھجور تلائی ہے، کسی نے انجیر کہا ہے کوئی کہتا ہے کہ اس درخت کے کھانے سے انسانی حاجت ہوتی تھی جو جنت کے لائق نہیں، کوئی کہتا ہے کہ اس درخت کا پھل کھا کر فرشتے ہمیشگی کی زندگی والے ہو جاتے تھے، امام ابن جریر[1] فرماتے ہیں کوئی ایک درخت تھا جس سے خدا نے روک دیا، نہ قرآن سے اس کی تعیین ثابت ہوتی ہے نہ کسی صحیح حدیث سے اور مفسرین میں اختلاف ہی اور اس کے معلوم کر لینے سے کوئی اہم فائدہ اور نہ معلوم ہونے سے کوئی نقصان نہیں، لہذا ہمیں اس کد و کاوش کی کیا ضرورت؟ اللہ ہی کو اس کا بہتر علم ہے، امام رازی وغیرہ نے بھی یہی فیصلہ کیا

---

[1] ان کا حوالہ اس لئے دیا گیا کہ قرآن کے سب سے پہلے مفسر یہی امام ابن جریر طبری ہیں جن کا سنہ وفات ۳۱۰ھ ہے انکے بعد جتنی بھی قدیم عہد میں تفسیریں لکھی گئی ہیں، اسی تفسیر سے ماخوذ و مستفاد ہیں

ہے اور بات بھی یہی معلوم ہوتی ہے "۔ (جلد ۱ صفحہ ۸۵)

اگر قرآن میں ایسی باتیں بھی ہیں کہ معلوم ہوں تو کوئی فائدہ نہیں اور نہ معلوم ہوں تو بھی کوئی نقصان نہیں، تو بات ٹھیک ہے اور کسی ایسے معاملے میں کدوکاوش کی ضرورت نہیں، مگر میں دیکھتا ہوں کہ ایک " جنّت " ہی کے معاملے میں سخت اختلاف اور بحث موجود ہے، اس کا کیا فائدہ تھا؟

علامہ محمد علی لاہوری نے " بیان القرآن " میں تحریر فرمایا ہے کہ :۔

" ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ " سے کون سا درخت مراد ہے؟ مفسّرین نے گیہوں، کھجور، کافور، انجیر، حنظل وغیرہ نام گنائے ہیں، مگر ان کا یہاں کیا مطلب؟ " ھٰذِہٖ " میں اشارہ قریب موجود ہے، پس اس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور قریب ترین جو ذکر ہے وہ " ابا " اور " استکبار " کا ذکر ہے، ...... یہاں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ " ھٰذِہٖ " میں اشارہ اسی شیطان کے ورغلانے کی طرف ہے جو انسان کی ترقی کی راہ میں روک بننا چاہتا ہے اور " ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ " سے مراد سوائے " بدی " کے اور کچھ نہیں "

(جلد ۱ صفحہ ۴۹)

ظاہر ہے کہ یہ مفہوم بالکل لغو ہے " بدی " کو " شجرہ " ان صاحب نے غالباً " توراۃ " کو دیکھ کر ہی لکھا ہے " توراۃ " میں ہے کہ :۔

" اور خداوند نے آدم کو حکم دے کر کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل کھایا کر لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت سے نہ کھانا، کیونکہ

جس دن تو اسے کھائے گا ضرور مرے گا ۔" (پیدائش ۲/۱۶و۱۷)

"نیک و بد کی پہچان" ہی تو انسان کا اصل شرف ہے، پھر اسی کی پہچان سے محرومیت کیا معنی؟

علامہ نیاز فتح پوری سے ایک صاحب نے استفسار کیا کہ "جناب اس مسئلہ پر صراحت کے ساتھ روشنی ڈالیں گے کہ وہ درخت کس چیز کا تھا؟" تو علامہ موصوف نے جواب دیا کہ:۔

"....لفظ آدم سے مراد کوئی مخصوص ہستی نہیں ہے بلکہ ساری نوع انسانی مقصود ہے، جب یہ متحقق ہو گیا تو اب اس افسانہ کا رنگ ہی دوسرا ہو جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں.... "ملائکہ" سے مراد وہ "قوتیں" ہیں جو کائنات میں بروئے کار نظر آتی ہیں اور.... "ابلیس" عبارت ہوگا صرف اُس قوت سے جو بدی کی طرف مائل کرتی ہے اور لفظ "شجر"[۱] استعارہ ہوگا، عدوان و بغاوت یا شر و فساد سے کیونکہ جس طرح ایک درخت کی شاخیں پھوٹتی ہیں اسی طرح بدی کے اثرات بھی وسیع ہوتے ہیں خود کلام مجید سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شجر سے مراد "شجر معصیت" ہے، چنانچہ سورۂ طٰہٰ میں.... معصیت کو "شجرۃ الخلد" اور "لازوال مملکت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔"

(مجموعۂ استفسار و جواب جلد ۳ صفحہ ۴۲۱)

مضمون ذرا لمبا ہے میں نے موضوع زیر بحث سے متعلق صرف ضروری ٹکڑے پیش

[۱] قرآن میں لفظ "شجر" نہیں بلکہ "شجرۃ" ہے

کئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ موصوف بھی لاہوری صاحب ہی کے ہم خیال ہیں، مگر سورۂ طٰہٰ کی آیت سے "شجرۃ الخلد" کو "معصیت کا شجر" ظاہر کرنا مستبعد ہے۔ کیا "ہمیشگی کے درخت" کی تعریف صرف "معصیت" کے لئے مخصوص ہے؟۔ پھر اگر "شجرۃ الخُلد" (طٰہٰ ۷) کے معنی "شجرِ معصیت" کے ہوئے، تب تو "عَذَابَ الْخُلْدِ" (سجدہ ۲) کے معنی "عذابِ معصیت" کے ہوئے؟ اور "جَنَّةُ الْخُلْدِ" (فرقان ۲) کے معنی ہوئے "جنّتِ معصیت"؟۔

علامہ سلیمان ندوی نے "سیرۃ النبی" جلد چہارم صفحہ ۵۷۵ (بڑی تقطیع میں پہلے "تورۃ" (سفر تکوین ۲) کا حوالہ دیا ہے کہ:۔

"تورۃ میں ہے کہ جنّت میں دو درخت تھے ایک "نیک وبد کی پہچان کا" اور دوسرا "زندگیٔ جاوید" کا تورۃ کے رُو سے آدم کو اسی نیک وبد کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا ہے لیکن آدم نے اُس کو کھالیا اور اس کی وجہ سے سب سے پہلے اُن کو اپنی برہنگی کا علم ہوا۔"

پھر تورۃ کا ایک اقتباس دیا ہے اور اس کے بعد اپنی رائے یوں پیش کی ہے:۔

"قرآن پاک میں اس "درخت" کا نام جس کے "پھل کھانے" سے آدم کو روکا گیا تھا، تصریحاً مذکور نہیں ہے لیکن ایک آیت سے اشارتاً معلوم ہوتا ہے کہ وہ "نیک وبد کی شناخت کا درخت" تھا اور شیطان نے یہ کہہ کر اُن کو کھلایا کہ یہ "حیاتِ جاوید" اور "ملکِ جاوداں"

کا درخت ہے مگر اس کے کھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی برہنگی کا علم ہوگیا جو نیک و بد کی تمیز کا نتیجہ ہے "

اس کے بعد اُنھوں نے بھی علامہ نیاز کی طرح سورہ طٰہٰ (رکوع ۷) سے شجرۃ الخلد" والی آیت پیش کر دی ہے۔ علامہ نیاز نے اسی "شجرۃ الخلد" کو "شجرِ معصیت" قرار دیا ہے۔ لیکن علامہ ندوی اسی کو "نیک و بد کی شناخت کا درخت" فرماتے ہیں۔ اور دونوں حضرات اپنی اپنی جگہ پر بڑا مرتبہ رکھتے ہیں جس وجہ سے سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کی قیاس آرائی کو صحیح سمجھا جائے؟ پھر مصیبت یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ علامہ ندوی صاحب موصوف نے اسی جلد میں پچاس ۵۰ صفحوں کے بعد لکھا ہے :-

"شیطان نے حضرت آدمؑ کے سامنے جس جنت کا نقشہ کھینچا تھا وہ بالکل صحیح تھا ..... مگر جنت کا یہ وصف سُنا کر اُن کو جدھر کا راستہ بتایا، وہ موت کے درخت اور فنا کے مُلک کی طرف تھا اور یہی وہ فریب تھا جس میں آدمؑ گرفتار ہوئے، چنانچہ اسی جنتی زندگی کی تلاش میں وہ چیز کھالی جو ان کے حق میں زہر تھی۔

"یعنی گناہ کا پھل"

نتیجہ یہ ہوا کہ جنتُ الخلد اور غیر فانی ملک سے نکل کر اُن کو اِس فنا کے ملک میں آنا پڑا " (صفحہ ۶۲۹)

غور فرمائیے، پہلے اقتباس میں اس "شجرہ" کو :-

"نیک و بد کی شناخت کا درخت"

کہا گیا تھا اور یہاں آدمؑ کے " کھانے " کی چیز بتائی جا رہی ہے :۔

" گناہ کا پھل "

ایسی صورت میں ہم عامیوں کو کیا پتہ چل سکتا ہے کہ " ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ " سے کیا مراد ہے ؟ ۔

مصر کے دورِ حاضر کے سب سے نامور مفسّر علامہ طنطاوی جوہری نے " تفسیر جواہر " میں اس موقع پر فرمایا ہے :۔

" یہ کس چیز کا درخت تھا ؟ اس کی تعیّن بہت مشکل ہے اور چنداں اہم بھی نہیں اس لئے ہم نظر انداز کرتے ہیں " (جلد ۱ صفحہ ۱۰۳)

علامہ عبدالماجد دریابادی بھی " القرآن الحکیم " میں لکھتے ہیں :۔

" یہ درخت جنّت کے درختوں میں سے کوئی معیّن اور آدمؑ کے لئے معلوم اور معروف درخت تھا لیکن اب اس کی تعیّن سے کوئی نتیجہ نہ تھا، اس لئے قرآن حکیم، جو کوئی بے نتیجہ بات نہیں کہتا اس سے خاموش ہے " (جلد ۱ صفحہ ۱۷)

سیّد ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے " تفہیم القرآن " میں لکھا ہے :۔

" یہ بحث غیر ضروری ہے کہ وہ درخت کون سا تھا ؟ اور اس میں کیا خاص بات تھی کہ اس سے منع کیا گیا ؟ منع کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس درخت کی خاصیّت میں کوئی خرابی تھی اور اس سے آدمؑ و حوّاؑ کو نقصان پہونچنے کا خطرہ تھا۔ اصل غرض اس بات کی آزمائش تھی کہ یہ شیطان کی ترغیبات کے مقابلے میں کس حد تک حکم کی پیروی پر قائم

رہتے ہیں، اس مقصد کے لئے کسی ایک چیز کا منتخب کر لینا کافی تھا
اسی لئے اللہ نے درخت کے نام اور اس کی خاصیت کا کوئی ذکر
نہیں فرمایا " (جلد ۱ صفحہ ۶۶)

بھلا اگر ایسا ہی تھا تو فی نفسہ اس قصہ ہی کو خواہ مخواہ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ ہم نے ایسا "کہا" تھا اور "آدم" نے ایسا "کیا" تھا؟ یہ آیت تو موجود ہی تھی:-

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ إِلَىٰٓ ءَادَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُۥ عَزْمًا (طٰہٰ ۶)

"اور اس سے پہلے ہم آدم سے ایک عہد کر چکے اور وعدے لے چکے تھے سو اُس نے خلاف معاہدگی کی۔ اور ہم نے اس میں پختگی نہ پائی۔"

مگر اس کے باوجود اس "هٰذِهِ الشَّجَرَةَ" والے قصے کو بیان کیا گیا خوب تفصیل سے بیان کیا گیا، ایک ہی کتاب میں متعدد جگہ بیان کیا گیا، بار بار دہرایا گیا۔ آخر یہ کیوں؟ متعدد جگہ ایک ہی قصہ کو ایک ہی کتاب میں چند طرح سے بیان کرنا غیر اہم، غیر ضروری اور بے نتیجہ نہ ہو، مگر ایک آدھ جگہ بھی "نام" بتا دینا، فضول، بے نتیجہ، غیر اہم اور بے ضرورت ہو جائے؟ ملائکہ پر آدم کو فضیلت تو اس لئے ملے کہ وہ چیزوں کے "نام" بتائیں مگر خود اُن کے ذکر میں کسی "درخت" کا نام بتانا فضول اور بے نتیجہ ہو جائے؟۔ "درخت" کا ذکر متعدد بار ہو تو وہ ٹھیک، لیکن کسی جگہ بھی اُس "درخت" کا نام لے دینا، لغو اور بے کار قرار پائے؟

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيٓ أَنزَلَ عَلَىٰ عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَل لَّهُۥ عِوَجًا (کہف ۱)

"تعریف ہے اس اللہ کی جس نے اپنے بندے پر ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں ذرا بھی اُلجھاؤ نہیں ہے۔"

(۲) كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ (ص ۳) یہ مبارک کتاب ہم نے تم پر اسلئے نازل کی ہے تاکہ لوگ اسکی آیات میں غور وفکر کریں۔"

اب اگر کوئی بات ہماری سمجھ میں نہ آئے تو ہم یہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ یہ غیر ضروری بات ہے ؟ یا کسی مقام پر ہمارے خیال و تدبر میں، کسی سلسلے کی کوئی کڑی غائب نظر آرہی ہو، تو ہم یہ کیسے فیصلہ کر دیں کہ یہ بے نتیجہ اور غیر اہم تھی، اس لئے اللہ تعالےٰ نے چھوڑ دیا ؟ ۔

انسانی علم، دماغ، عقل سب ناقص ہے۔ کوئی شخص، ہر نکتہ کا احاطہ نہیں کر سکتا، ہر بات یقیناً ہر زمانہ میں سمجھ ہی نہیں لی جاسکتی، اس لئے جہاں پر اور جب تک کوئی بات ہماری سمجھ میں نہ آرہی ہو، ہمیں کسی غیر مناسب فیصلہ صادر کر دینے سے بہتر ہے کہ ہم ایمان داری سے یہ تسلیم کرلیں کہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔

قرآن کے کسی بھی مسئلے کے متعلق یہ اعتراف کہ میں نے نہیں سمجھا ہے علم و فضل پر کوئی حرف نہیں لاتا، کیونکہ وہ خدا کی کتاب ہے، اور انسانی علم بہر حال نقص سے پاک نہیں ہے۔

"شیخ الہند" علامہ محمود الحسن صاحب کے ترجمۂ قرآن پر بڑا لمبا چوڑا حاشیہ "فوائد" کے عنوان سے درج ہے، اس میں سورۂ "نساء" تک کا حاشیہ خود "شیخ الہند" کا لکھا ہوا ہے اور بقیہ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کا۔ "شیخ الہند" نے سورۂ "بقرہ" والی آیت کے سلسلے میں حاشیہ لکھا ہے کہ:۔

"مشہور ہے کہ وہ درخت گیہوں کا تھا، یا بہ قول بعض انگور یا انجیر یا ترنج وغیرہ کا۔ واللہ اعلم "

اور علامہ شبیر احمد عثمانی نے " سورۂ اعراف " والی آیت کے سلسلے میں حاشیہ لکھا ہے کہ :-

" آدم و حوا کو اجازت تھی کہ بلا روک ٹوک جو چاہیں کھائیں پئیں. بجز ایک " معین درخت " کے جس کا کھانا ان کی بہشتی زندگی اور استعداد کے مناسب نہ تھا اُسے فرمایا کہ اس کے پاس نہ جاؤ ورنہ نقصان اُٹھاؤ گے "

بھلا ان سطور سے کیا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں " فوائد " کے لقب سے زینتِ قرآن بنایا گیا؟ علامہ اشرف علی تھانوی نے بھی اپنی تفسیر " بیان القرآن " میں ایسا ہی کچھ فرمایا ہے، لکھتے ہیں :-

" خدا جانے وہ کیا درخت تھا مگر اس کے کھانے سے منع فرما دیا اور ہر آقا کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ اپنے گھر کی چیزوں میں سے غلام کو جس چیز کے برتنے کی چاہے اجازت دیدے، جس کو چاہے منع کردے " (جلد ۱ صفحہ ۲۰)

جو لوگ تفسیریں لکھتے ہیں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ " قرآن " کو سمجھایا جائے، یعنی وہ باتیں بتائی جائیں، جو بادی النظر میں ہر شخص کے لئے صاف نہ ہوں اور جو عوام کی دسترس سے باہر ہوں، ورنہ سیدھی سادی بات اور واضح آیت کو تو سب ہی سمجھ لیتے ہیں۔ پھر اگر وہ مقامات یوں ہی " واللہ اعلم " اور " خدا جانے " کہہ کے علیٰ حالہ چھوڑ دینے پڑتے ہوں تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر " تفسیر " لکھنے کی زحمت ہی گوارا کیوں کی جائے؟ ۔

علامہ حسن سبحانی آزاد نے اپنی " ربانی یونیورسٹی " سے " ایضاح القرآن "
کے نام سے حال میں ایک " تفسیر " شائع کی ہے جو صرف پہلے پارہ کی ہے۔
اس میں انھوں نے فرمایا ہے :-

" آدم کو جس کام سے روکا گیا تھا وہ تو ایک درخت کا پھل کھانا تھا بھلا ایک درخت کا پھل کھانے کو تمدن اور تمدنی زندگی کے ظہور سے کیا تعلق ؟ غالباً درخت سے مراد جیسا کہ " بائبل " میں اشارہ کیا گیا ہے، استعارہ کے طور پر " غور و فکر " کا عمل تھا " غور و فکر کا عمل " بے شک وہ درخت ہے جس کا " پھل " اگر وہ کھا لیا جائے، تمدن اور تمدنی زندگی میں داخل کر دیتا ہے، یہ تمدن اور تمدنی زندگی جو تمہارے سامنے ہیں، انسان کے غور و فکر ہی کی تو پیداوار ہیں۔ انسان نے کھیتی کرنا، کپڑا بننا، گھر بنانا، تجارت کرنا، جنسی تعلق قائم کرنا، اولاد پیدا کرنا، کیسے سیکھا ؟ غور و فکر ہی سے تو ؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ " باغ عدن " میں جہاں آدم مقیم تھے کوئی درخت بھی ایسا رہا ہو جس کے " پھل " کا اثر سوئی ہوئی عقل کو جگا دینا اور اس کی منجمد قوتِ غور و فکر میں حرکت کی لہر پیدا کر دینا ہو "

(جلد ۱ صفحہ ۲۸)

خواجہ احمد الدین صاحب (امت مسلمہ، امرتسر) نے اپنی مشہور تفسیر " بیان للناس "
کے صفحہ ۱۶۳ (جلد ۱) پر فرمایا ہے :-

" حضرت آدم و حوا علیہم السلام اور ان کی اولاد آسمان سے نہیں گرائے

گئے تھے، کیونکہ وہ زمین ہی میں " خلیفہ " بنائے گئے تھے، اگر " ھبوط " کا مطلب یہ ہے کہ ایک باغ سے نکل کر دوسرے باغ میں جانکلو، تو یہ کوئی سزا نہیں، پس " ھبوط " سے مراد ضرور بالفرض اعلیٰ حالت سے گر کر ادنیٰ حالت میں آجانا ہے، جس جنّت میں انسان " بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ " ہوجانے کے سبب نہیں رہ سکتا، وہ اطمینان قلبی ہی کا جنّت ہے، اور جب یہ ثابت ہوا کہ وہ جنّت، اعلیٰ فطری حالت اور قلبی اطمینان ہی کا تھا تو کیا " شجرِ ممنوعہ " سے گیہوں، انجیر یا انگور کی قسم کا کوئی درخت مُراد لینا بھی صحیح ہوسکتا ہے؟ وہ " شجرِ ممنوعہ " جس کے چکھنے سے حضرت آدم و حوا علیہم السلام ظالم بن گئے اور ان میں دشمنی کا بیج لگ گیا اور اُن کا " لباس التقویٰ " اُتر گیا، کیا وہ کوئی ظاہری درخت ہوسکتا ہے؟

جس درخت کے " چکھنے " سے ان کے " سوات " یعنی کمزوریاں اور عیب کھُل گئے اور جوش میں آگئے، وہ کسی ظاہری باغ کا " درخت " نہیں تھا، وہ " اختلاف و فرقہ بندی کا شجرہ " تھا، جو لوگ قرآن حکیم کے طرزِ بیان پر غور نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ظاہری درخت نہ تھا تو اس کے لیے " چکھنے " اور " کھانے " کا لفظ کیوں آیا ہے؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ جب فطرتِ سلیمہ والی حالت کو " جنّت " کہا تو کیا اس مناسبت

سے مشابہت والی چیز کو " شجرہ " نہیں کہنا چاہیے تھا؟ اور
" شجرہ " کی مناسبت سے " چکھنے " اور " کھانے " کے
الفاظ لانا بالکل مناسب تھا "

گویا فاضل مفسّر کے نزدیک " اختلاف و فرقہ بندی " کو " شجرہ " کہا گیا ہے اور موصوف آدمؑ و حوّا کو " علیہم السلام " بھی فرماتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ یہ دونوں مخصوص شخصیّتیں تھیں، اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں مخصوص افراد " علیہم السلام " نے " اختلاف و فرقہ بندی " کا کون سا مظاہرہ کیا تھا جس کو قرآن نے " فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ " " سو جیوں ہی انھوں نے شجرہ کا مزہ چکھا " کہا ہے؟ اس کا جواب کہیں پر نہیں دیا گیا ہے، آخر دونوں مخصوص شخصیّتوں سے کچھ تو حرکت ایسی ہوئی ہوگی جس کو کہا گیا کہ " انھوں نے چکھا " ؟ ان ایک مرد اور ایک عورت میں کون سا " اختلاف " ہوا۔ ان کی " فرقہ بندی " کا کون سا ثبوت ملا جس کو " ذَاقَا الشَّجَرَةَ " کہا گیا ؟ -

سرسیّد احمد خاں نے اپنی " تفسیر احمدیہ " جلد ۱ صفحہ ۶۵ پر فرمایا ہے :-

" اس کے بعد خدا تعالیٰ نے انسان کی زندگی کے دونوں حصّوں کو بتایا ہے، پہلے حصّہ کو یعنی جب کہ انسان غیر مکلّف اور تمام قیود سے مبرّا ہوتا ہے، بہشت میں رہنے اور چین کرنے اور میووں کے کھاتے رہنے سے تعبیر کیا ہے، اور جب دوسرا حصّہ اس کی زندگی کا شروع ہونے والا ہے تو اس کے قدیم دشمن کو پھر بلایا ہے جس نے اس کو بہکا کر " درخت ممنوعہ " کو کھلایا ہے "

یہ وہ حصّہ انسان کی زندگی کا ہے جب کہ اس کو رُشد ہوتا ہے اور عقل و تمیز کے درخت کا پھل کھا کر مکلّف اور اپنے تمام افعال واقوال و حرکات کا ذمّہ دار ہوتا ہے ۔ زندگی کے ضروری سامان کے لیئے خود محنت کرتا ہے ، اور نیک و بَد کو خود سمجھتا ہے ، اپنی بدی سے واقف ہوتا ہے اور اس کو چھپاتا ہے ، یہ فطرت انسانی ، خدا تعالیٰ نے باغ کے استعارہ میں بیان کی ہے ، اس کے تمام فطرت کو باغ ہی کے استعارہ میں بیان فرمایا ہے ، سنِ رُشد و تمیز کے پہونچنے کو " درختِ معرفتِ خیر وشر کے پھل کھانے سے اور انسان کا اپنی بدیوں کے چھپانے کو درخت کے پتّوں سے ڈھانکنے سے تعبیر کیا ہے ، مگر " شجرۃ الخلد " کے پھل تک اُس کو نہیں پہونچایا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک فانی وجود ہے اور اس کو دائمی بقا نہیں "

محترم سرسیّد پھر کچھ اور آگے بڑھ کر صفحہ ۶۹ پہ فرماتے ہیں :-

" یہ ایک نہایت عمدہ اور دلچسپ بیان فطرتِ انسانی کا ہے مگر عام لوگ اس رازِ فطرت کے سمجھنے کے قابل نہ تھے ، اس لئے خدا نے ابتداء سے اس راز کو ایک دلچسپ قصّہ کے پیرایہ میں بیان کیا ہے ، جس کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے اور جو نتیجہ رازِ فطرت سے انسان کو حاصل ہونا چاہیئے وہ ہر شخص کو حاصل ہوتا ہے "

محترم سرسیّد موصوف نے ایک نئی راہ نکال دی ہے ، وہ کہتے ہیں کہ :-

" سن رُشد و تمیز کے پہونچنے کو درختِ معرفتِ خیر وشر کے پھل کھانے سے تعبیر کیا ہے ۔ "

گویا آدم اور ان کی بیوی کو جو یہ کہا گیا کہ "شجرہ کے پاس مت جانا" اس سے اللہ تعالیٰ کی مُراد یہ تھی کہ آدم اور ان کی بیوی نہ تو "سنِ رُشد" کو پہونچیں اور نہ اُن کو کبھی "تمیز" آئے اور نہ اُن کو کبھی "معرفتِ خیر وشر" حاصل ہو۔ اگر آدم کو اُس درخت سے "کھانے" کا حکم ہوتا تو ایک بات بھی تھی کہ آدم کو "سنِ رُشد" کو پہونچنے اور "تمیزِ معرفتِ خیر وشر" کرانے کے لیئے کھانے کا حکم دیا گیا، مگر "روکنے" کی یہ تعبیر عجیب وغریب ہی نہیں بلکہ ناقابلِ فہم بھی ہے، پھر مزید اُنھوں نے فرمایا ہے کہ :۔

"انسان کا اپنی بدیوں کو چھپانے کو درخت کے پتّوں سے ڈھانکنے سے تعبیر کیا ہے"

بھلا یہ کون سی بات ہوئی؟ اس تعبیر میں کیا لطافت تھی کہ "بدیوں" کے چُھپانے کو "درخت کے پتّوں سے ڈھانکنے" سے تعبیر کیا گیا؟ کہا جاتا ہے کہ "پڑھے لکھے کی تقدیر پتّوں کے نیچے ہوتی ہے" مطلب یہ ہوتا ہے کہ ذرا سی "ہوا" اُن پتّوں کو ہٹا سکتی ہے اور پڑھے لکھے کا مقدر یاور ہو سکتا ہے، بھلا "بدی" کو "پتّوں" سے چھپانے کے معنی تو یہ ہوئے کہ وہ جلد ہی لوگوں پر ظاہر ہو جائے؟ دراصل سر سیّد مرحوم نے "فطرتِ انسانی" کی تعبیرات پر قرآنی آیات کو منطبق کرنے میں قرآنی الفاظ کو سرے سے نظر انداز کر دیا ہے اسی لیئے ایسی باتیں فرما گئے ہیں جو کسی طرح قابلِ فہم نہیں ہیں۔

علّامہ عبداللہ یوسف علی (جن کا ابھی حال میں ۱۲/ دسمبر ۱۹۵۳ء کو انتقال ہوا ہے) کا قرآن کا انگریزی ترجمہ، دورِ حاضر کے تمام انگریزی ترجموں میں سب سے بہتر اور

مستند تسلیم کیا جاتا ہے، موصوف نے سورۂ بقرہ والی آیت کے تحت زیر بحث مسئلہ کی تفسیر یہ تحریر فرمائی ہے :-

"PERHAPS TIME AND SPACE ALSO DID NOT EXIST, AND THE GARDEN IS ALLEGORICAL AS WELL AS THE TREE. THE FORBIDDEN TREE WAS NOT THE TREE OF KNOWLEDGE FOR MAN WAS GIVEN IN THAT PERFECT STATE FULLER KNOWLEDGE THAN HE HAS NOW:- IT WAS THE TREE OF EVIL, WHICH HE WAS FORBIDDEN NOT ONLY TO EAT OF, BUT EVEN TO APPROACH."

اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے :-

"غالباً زمان و مکان کا بھی وجود نہیں ہے، اور "جنت" و "شجر" دونوں محض "تمثیلی" ہیں۔ "شجرِ ممنوعہ" کسی علم کا درخت" نہیں تھا۔ اس لئے کہ انسان کی تخلیق تو ایسے مکمل علم کے ساتھ ہوئی تھی کہ اب وہ اس کا محتاج تھا ہی نہیں، بلکہ یہ "شجرِ معصیت" تھا کہ جس کے صرف کھانے ہی کو منع نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کے قریب جانے سے بھی انسان کو باز رکھا گیا تھا۔"

بات تو کچھ بھی نہیں بنی۔ اول تو آدم کو "کھانے" سے منع نہیں کیا گیا تھا بلکہ صرف "قریب جانے" سے، دوسرے جب یہ "شجرِ معصیت" تھا جس کا کوئی "وجود"

ہی نہ تھا اور یہ محض "تمثیلی" تھا تو اس کے لئے "ھٰذِہٖ" کے اشارۂ قریب کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر جب یہ کہا گیا کہ "انھوں نے اس کو چکھ لیا" تو بتانا چاہیئے تھا کہ کون سی "معصیت" تھی جو آدمؑ نے کی؟ کیونکہ نہ صرف اس کا ذکر ہے کہ "اُنھوں نے چکھا" بلکہ خود آدمؑ کا بھی اعتراف ہے کہ "ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا" ہاں "ہم نے اپنے آپ پر ظلم کر لیا ہے" پھر وہ کون سی "معصیت" تھی جس کا انھوں نے ارتکاب واعتراف کیا؟ کس چیز کو کہا گیا ہے کہ "انھوں نے چکھا"؟ اور کس فعل کی بنا پر انھیں وہ "جنت" چھوڑنی پڑی، جو اُن کو ملی ہوئی تھی؟

اگر آدمؑ کا "علم" مکمل تھا ہی تو انھیں اس "درخت" کا علم پہلے سے خود ہی ہونا چاہیئے تھا! اللہ تعالیٰ کو پھر یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ "دیکھو یہ جو درخت ہے، اس کے پاس نہ جانا؟ اور پھر ابلیس نے اس درخت کے بارے میں جو علم" آدمؑ کو دیا کہ اس درخت میں فلاں فلاں خوبیاں ہیں لہذا تم کو اس سے روکا گیا ہے، تم اس کو ضرور کھاؤ، میں تمہارا ناصح مشفق ہوں، تو آدمؑ نے اس کی بات مان کر کیوں کھا لیا جب کہ اُن کا "علم" پہلے ہی سے "مکمل" تھا؟ ان تمام اعتراضات کا کوئی جواب اس تفسیر میں موجود نہیں ہے۔

میں نے تقریباً تمام قدیم وجدید اور ہر "فرقہ" ہر "اسکول" اور ہر "مکتبۂ خیال" کے مسلّم اکابرین کی رائیں یا ان کا خلاصہ پیش کر دیا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ "ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ" جس طرح تیسری صدی میں پیچیدہ اور لاینحل تھا ویسا ہی آج بھی ہے! اور ہمارا یہ ہزار سالہ بے پناہ سرمایۂ تفسیر وتحقیق اس

مسئلہ کو حل کرنے سے عاری و عاجز ہے ؟ بلکہ " شُد پریشاں خواب مِن از کثرتِ تعبیرہا"

" انجیر " کا درخت یہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ " انجیر " وہ مقدس و محترم

" پھل " ہے جس کی خود اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے :-

وَالتِّیْنِ (التین ۱) " انجیر کی قسم "

ظاہر ہے کہ ایسے مقدس پھل کو کھانے سے ، آدم کو ہرگز منع نہیں کیا جاسکتا تھا۔

" انگور " کا خیال سرے سے لغو ہے کیونکہ " انگور " اوّل تو نہایت پاکیزہ

" پھل " ہے دوسرے " انگور کی بیل " کو " درخت " خدا کیا کہتا جب کہ

انسان بھی نہیں کہتا ہے ، خود سوچیے نا کہ " انگور کی بیل " یا " انگور کی رَت "

کہلاتی ہے یا " انگور کا درخت " ؟ اگر " انگور " کے لئے بھی " درخت " ہی

کا لفظ آوے گا تو معلوم نہیں " آم " اور " لیچی " کے " درخت " کو کیا کہا جائیگا ؟

" کھجور " کا درخت بھی یہ نہیں ہوسکتا کیونکہ " کھجور " اور " انگور " وغیرہ

وہ " میوے " ہیں جن کو " قرآن " نے " انسان " کے لیے " متاع " قرار

دیا ہے ، پھر وہ آدم پر حرام کیسے کیا جاسکتا ہے ؟ انھیں تو " انسان " کی عین

غذا بنایا گیا ہے :-

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ
اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا
الْاَرْضَ شَقًّا ۝ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝ وَّ
عِنَبًا وَّ قَضْبًا ۝ وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ۝ وَّ
حَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ۝

" سو انسان ذرا اپنے کھانوں ہی پر غور کرنا
کہ ہم کس عجیب طریقے پر پانی برساتے ہیں ،
پھر زمین کو پھاڑتے ہیں ، پھر اس میں سے
غلہ انگور ، ترکاری ، زیتون اور کھجور اور
گنجان باغ اور دوسرے میوے اور چارے پیدا

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ " کرتے ہیں جو متاع ہیں تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے " (عبس ۱)

پھر بھلا جو انگور اور کھجور " انسان " کے لئے " متاع " اور " طعام " ہوں وہ " آدم " کے لئے "ممنوع" کس طرح قرار دیئے جا سکتے ہیں ؟ اور جب ان تمام پھلوں کا نام قرآن میں لیا ہی گیا ہے تو " آدم " کے سلسلے میں اس کو کھول دینے میں کیا دقت تھی ؟ لہذا یہ انگور کھجور اور انجیر کا درخت ہرگز نہیں تھا۔

یہ کافور" اور " حنظل " کا بھی "درخت " نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ " کافور" کوئی " پھل " نہیں ہے بلکہ محض گوند " ہے اور " حنظل " دراصل " اندرائن " کو کہتے ہیں اس کا بھی " درخت " نہیں ہوتا بلکہ " بیل " اور " لت " ہوتی ہے قرآن کسی " بیل " یا " لت " یا "پودا " کو " نجم " کہتا ہے " شجر " نہیں۔ نیز یہ تلخ دوائیں ہیں ان کو " جانور " بھی نہیں کھاتے، چہ جائیکہ " آدم " کیا کھاتے ؟ یوں بھی آدم " علم الاشیاء " کے ماہر تھے، لہذا ان چیزوں کو ہرگز نہ کھاتے، پھر منع کرنے کی ضرورت کیا تھی ؟ اور نہ یہ ایسی چیزیں تھیں کہ جن کو مطلقاً حرام کیا گیا ہو، " دوا " میں ضرورتاً، آخر انسان کھاتے ہی ہیں " کافور " کو " آدم " کے لئے " ممنوع " سمجھنے کی جدت، قابلِ داد ہے جب کہ " اولادِ آدم " جب " جنت " میں جائیں گے تو انھیں یہ چیز بطور " نعمت " ملے گی :-

إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِن كَأْسٍ " جو لوگ نیک عمل ہوں گے وہ ایسے جام كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا شراب پئیں گے جس میں کافور ملا ہوا ہوگا " (دھر ۱)

" سُنبلہ " دراصل گیہوں اور جَو کی بال کو کہتے ہیں لہذا " سُنبلہ " اور " گیہوں "

ایک ہی چیز کے دو نام ہوئے "گیہوں" ممنوع ، ہو ہی نہیں سکتا ، کیونکہ اوّل تو "گیہوں" کا "درخت" نہیں ہوتا بلکہ "پودا" ہوتا ہے ، آج تک آپ نے کسی جاہل واحمق انسان کو بھی چاول ، بُونٹ اور گیہوں کا "درخت" بولتے سُنا ہے ؟ اگر گیہوں کے لئے بھی "درخت" ہی کا لفظ بولا جائے گا تو "بڑ" اور "پیپل" کے لئے کون سا لفظ ہے ؟ ۔ پھر آدم تو ہر شے کا علم رکھتے تھے ہر چیز کے نام وخاصیت سے باخبر تھے ہی ، بھلا یہ کیونکر ہوتا کہ وہ "گیہوں" کھاتے ، کیا دنیا میں کوئی وحشی سے وحشی انسان بھی بجائے خود "گیہوں" کو کھاتا ہے یا اس کی "روٹی" پکا کر کھاتا ہے ؟ پھر آدم جن کو سارا علم دیا جا چکا تھا ، بجائے خود گیہوں " ہی کو کیسے کھا لیتے ؟ ۔

" حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسولؐ خدا صلعم سے پوچھا کہ "گندم" کھا لینے میں کیا حرج ہے ؟ "روٹی" کیوں پکائی جاتے ؟ جواب ملا ، اس لئے کہ انسان کو جانور مان لینے میں حرج ہے ! "

(رسالہ آستانہ (دہلی) اکتوبر ۵۴ء صفہ ۴۲)

پھر جب "روٹی" پکا کے کھانے کے بدلے خود گیہوں کو کھانا انسانیت نہیں حیوانیت ہے تو آدم کبھی کھا سکتے تھے ؟ سنبلہ یا گیہوں کا خیال یوں بھی لغو ہے "سُنبلہ" ایسا گرا ہوا لفظ نہیں کہ قرآن "قصۂ آدم" میں اس کو استعمال کرتے ہوئے شرماتا ۔ ایک جگہ ہے :۔

سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ ۔ (البقرہ ۳۶) " سات بالیں جس کے ہر بال میں "

گیہوں بھی ایسی ناپاک چیز نہیں ، جس کا نام لینے سے قرآن کو پرہیز ہو ۔ جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تھے اور وہ "من وسلویٰ" کھاتے کھاتے اُکتا گئے تھے تو انھوں نے

دوسری چیزیں کھانے کی طلب کی تھیں اور ان میں یہ "گیہوں" بھی تھا:۔

یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ "وہ ہمارے لئے ایسی چیزیں بھیجے جو
مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا زمین سے اگتی ہیں جیسے ساگ، ککڑی
وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا (بقرہ)، گیہوں، مسور اور لہسن پیاز وغیرہ"

جب گیہوں اور سنبلہ کا نام کھلم کھلا قرآن میں آیا ہی تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ آدم کے قصے میں اس جگہ اس چیز کا نام لے کر بات صاف نہ کر دی جاتی، بہر حال اُهٰذِهِ الشَّجَرَةَ" میں "شجرہ" سے مراد ہرگز کوئی میوہ یا کوئی غلہ یا کوئی پھل یا کوئی دوا نہیں اور ایسا کہنا زبردستی کی ھوڑنس ٹھانس کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ "جنت" میں جو چیزیں بھی ہیں وہ "نعمت" ہیں اور "دائمی نعمت" ہیں :۔

فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ (توبہ ۳) "اس میں سب دائمی نعمتیں ہیں"

دوسرے اگر واقعی یہاں کوئی "پھل" ممنوع ہوتا تو لفظ "شجرہ" کبھی بھی نہیں آتا بلکہ "ثمرہ" (پھل) آتا۔ کیونکہ کوئی بھی "درخت" نہیں "کھایا" جاتا بلکہ "پھل" کھایا جاتا ہے، جنتیوں کے ذکر میں ہے کہ :۔

(۱) كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ "جب کبھی وہ دیئے جائیں گے ان
رِزْقًا۔ (بقرہ ۳) بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا"

(۲) لَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ "ان کے لئے وہاں ہر قسم کے
(محمد ۲) پھل ہوں گے"

پھر جب "جنت" میں "پھل" کھایا جاتا ہے یا کھانے کو ملے گا تو "آدم" سے یہ کہنا کیا معنی کہ "درخت نہ کھانا"؟ پھر "نہ کھانا" تو کہا بھی نہیں گیا ہے۔

یہ "نیکی و بدی کی تمیز کا درخت" بھی ہرگز نہیں ہو سکتا نہ "معرفتِ خیر و شر" کا اور نہ "غور و فکر کا درخت" کیونکہ یہی "تمیز" و "تدبّر" اور "معرفت" تو "شرفِ انسانیت" ہیں۔ اگر یہی، تینوں چیزیں "آدم" کے لئے "ممنوع" ہو جاتیں تو پھر "آدم" اور "انعام" میں فرق ہی کیا رہ جاتا؟ اور تب یہ کائنات کی تمام مخلوق اور طاقتوں کو "آدم" کے سامنے جھکانے کے معنی کیا ہوتے؟ بلکہ اس اعتبار سے تو بطورِ خاص "آدم" کو تاکید کرنا چاہیئے تھا یا کیا جاتا کہ دیکھو "نیکی و بدی کی تمیز" یا "معرفتِ خیر و شر" اور "غور و فکر" کا جو درخت تمہارے سامنے موجود ہے، اس درخت سے جس قدر ہو سکے، تم خوب خوب کھاؤ تاکہ تمہاری یہ صلاحیتیں ٹھکانے سے ابھر جائیں۔ برخلاف اس کے یہ "درخت" ان کے لئے "ممنوع" قرار دیا گیا، لہذا ہرگز یہ "نیکی و بدی کی تمیز" یا "معرفتِ خیر و شر" یا "غور و فکر" کا درخت بھی نہیں ہو سکتا، جو چیز عین خصوصیتِ آدم اور شرفِ انسانیت ہے اسی سے "آدم" کو روکنا کیا معنی؟۔

یہ "معصیت" اور "بدی" کا بھی درخت ہرگز نہیں ہو سکتا کیوں کہ "فجور" اور "تقویٰ" دونوں کی صلاحیتیں اور تمیزیں تو "انسان" کو "الہام" اور "عطا" کر دی گئی ہیں۔ اور نیکی و بدی کے دونوں راستے انسان کو بتا کر اس کو اختیار و ارادہ کا مالک بنایا گیا ہے کہ تم خود سمجھ بوجھ کر جس کو پسند کرو اور چاہو اسے اختیار کرو :۔

(۱) فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا "سو اس کو ہم نے الہام کر دیا بدکرداری بھی اور پرہیزگاری بھی" (شمس ۱)

(۲) فَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (بلد ۱) " اور اس کو دونوں راہیں دکھا دی گئیں "

(۳) بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ (قیامت ۱) " بلکہ انسان کی بصیرت اس کی ذات پر چھوڑ دی گئی ہے "

(۴) فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (دھر ۲) " سو اب جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کرے "

لہذا ہرگز " آدم " پر زبردستی نہیں کی جا سکتی تھی اور ان کو بہ جبر " معصیت " اور " بدی " کے نزدیک جانے سے نہیں روکا جا سکتا تھا۔

رہا آخری خیال کہ یہ کوئی " متعیّن درخت " تھا، جو " ممنوع " تھا۔ سو اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے کیونکہ یہاں " شجر " نہیں کہا گیا ہے دوسرے " جنت " میں کوئی " درخت " ایسا ہے ہی نہیں جس کا پھل " ممنوع " ہو :-

فَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّ لَا مَمْنُوْعَةٍ (واقعہ ۱) " وہاں کثرت سے میوے ہیں جو نہ تو کبھی ختم ہی ہونے والے ہیں اور نہ انہیں سے کوئی ممنوع ہے "

لہذا کسی " درخت کا پھل " آدم کے لئے " ممنوع " ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہو سکتی ۔ اور بالفرض اگر کوئی " درخت " جنت میں " مخصوص " ہوتا تو اس کا پھل ممنوع ہوتا، کیونکہ کھایا یا چکھا تو " پھل " جاتا ہے نہ کہ درخت ؟ ۔ خود قرآن کا یہی انداز گفتگو ہے۔ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ ...... لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ (یٰسین ۲) " ہم نے زمین میں باغ لگائے ...... تاکہ لوگ اس کے پھلوں میں سے کھائیں "

(۲) كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ (انعام ۱۷) کھاؤ اس کے پھلوں میں سے جب وہ پھل جائے " مدھ مکھی تک تو پھل چوستی ہے:۔

ثُمَّ کُلِی مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ (نحل ۹) "پھر وہ ہر قسم کے پھلوں سے چوستی ہے"

پھر آدم کیا دھکّے سے بھی گئے گزرے تھے کہ جنت ہی کو چکھتے؟ اور وہ بھی گیہوں کے؟ اور وہ بھی آسمانی جنت میں؟ کیا وہاں بھی "کاشتکاری" ہوتی ہے، اور فرشتے بھی جو گیہوں بونٹ وغیرہ کی کھیتی کرتے ہیں؟ درصل "قرآن" میں بیان کردہ قصۂ آدم کو سمجھنے اور سمجھانے میں، فکر کو صرف "قرآن" تک محدود نہیں رکھا گیا ہے جس وجہ سے اس قصّے کے بہت سے مسائل ایسے اُلجھ گئے کہ آج تک سُلجھ نہیں پائے ہیں۔ مثلاً قصۂ آدم میں "ملائکہ" کا مطلب "فرشتہ" سمجھا گیا اور اعتراض تخلیق وافتخارِ تسبیح کو فرشتوں سے منسوب کر دیا گیا، حالانکہ فرشتے محض قدرت کی تنین کائنہ ہیں۔ جن کا کام صرف حکم پر چلنا ہے، وہ جذبات رکھتے ہی نہیں کہ کسی حکم کی نافرمانی کریں یا بجا آوری حکم پر فخر و ناز۔ درصل یہ "جنّات" تھے جن کو اپنی تسبیح و تحمید پر یوں ناز تھا کہ:-

نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ "ہم تو تیری تسبیح و تحمید کرتے ہی ہیں"

سُورۂ والصّٰفّٰت کی آیتوں سے یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے۔ کہ تسبیح کا ناز "فرشتوں" کو نہیں بلکہ "جنّات" کو ہے:-

وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ "اور جنّات بھی خوب جانتے ہیں کہ وہ حاضر ہونگے ..... (انکا کہنا ہے کہ) ہم تو صف بستہ کھڑے ہونیوالے ہیں اور ہم تو تسبیح کرنیوالے ہیں" ..... وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ (والصّٰفّٰت ۵)

بالکل یہی صورت قصۂ آدم میں "شجرہ" کی ہے کہ اس کا مطلب "درخت" سمجھ لیا گیا حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ "نباتات" کا ذکر اکثر قرآن میں آیا ہے "نباتات" کی دو قسمیں ہیں ایک "تنہ دار" جس کو "درخت" کہا جاتا ہے اور دوسری "بے تنہ دار" جسکو پودا یا لتا یا بیل کہتے ہیں سورۂ رحمٰن کی چھٹی آیت ہے:-

وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ "پودے اور درخت سب سجدہ میں لگے ہیں"

"شجر" کی کیا تعریف ہے؟ یہ سورہ ابراہیم رکوع ۴ میں بیان کردی گئی ہے کہ "اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ" (جس کی جڑ زمین میں مضبوط گڑی ہو اور جس کی شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں) قرآن میں جتنی جگہ بھی "شجر" کا لفظ آیا ہے وہیں پلا آیا ہے جہاں "تنے دار درخت" مراد ہے، مثلاً بیعتِ رضوان والا درخت (فتح ۳) طورِ سینا والا درخت (مومنون ۱) موسیٰ ع کو متوجہ کرنے والا درخت (قصص ۴) مدھ مکھی کے چھتہ بنانے والا درخت (نحل ۲) حضرت یونس کو جب مچھلی نے اگلا تو وہ مضمحل تھے ضرورت تھی کہ دھوپ وغیرہ سے ان کو بچایا جائے۔ محض "درخت" اس لئے بیکار تھا کہ اُس کے پتے اتنے چوڑے نہیں ہوتے کہ ایک بیمار کو دھوپ سے بچا سکیں، اور صرف "پودا" اس لئے بیکار تھا کہ اُس کے نیچے ایک انسان پناہ نہیں لے سکتا تھا، لہٰذا یوں کیا گیا کہ ایک تنے دار درخت پہ ایک "لت" پھیلا دی گئی۔

وَأَنْبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّن يَّقْطِينٍ (والصّٰفّٰت ۵) "اور ہم نے اس پر ایک درخت اگا دیا بیل دار میں سے"۔ اگر شجر کے معنی "پودا" ہوتے تو یہاں "یقطین" کہنے کی ضرورت نہ تھی اس آیۃ پر علامہ اشرف علی تھانوی کا حاشیہ بھی ہے کہ:- "شاید اس میدان میں کوئی تنے دار درخت ہوگا جس کے پتے سایہ دار نہ ہوں گے اُس پر ایسا بیلدار درخت جس کے پتے چوڑے ہوں پھیل گیا ہوگا جس کا تعین بھی بعض روایات میں ہے کہ کدو کی بیل تھی۔ اب یہ وسوسہ نہیں رہا کہ زمین پر پھیلنے والے درخت کا اُن پر سایہ کیسے ہوا؟" گیہوں کا "پودا" کہلاتا ہے "درخت" نہیں، لہٰذا قصۂ آدم میں "گیہوں" تو کبھی ممنوع ہو ہی نہیں سکتا، دراصل یہاں "شجر" یعنی "درخت" آیا ہی نہیں، مگر چونکہ جہنم میں ایک "مخصوص درخت" ہونے کا ذکر قرآن میں ہے:-

إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ (والصّٰفّٰت ۲) "وہ ایک درخت ہے جو نکلتا ہے دوزخ کی جڑ میں"

لہذا سوچا گیا کہ " جنّت " میں بھی کوئی ایک " مخصوص درخت " ضرور ہوگا یا ضرور ہونا چاہیئے، چنانچہ سمجھ لیا گیا کہ " جنّت " میں بھی ایک " مخصوص درخت " یقیناً تھا، یا ہے ۔ اس طور پر " جنّت " اور " جہنّم " دونوں کو برابر کر دیا گیا، مگر اس پر غور ہی نہیں کیا گیا کہ " جہنم " والے " مخصوص درخت " کی تو قرآن میں مذمت کی گئی ہے :-

وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِى الْقُرْاٰنِ " اور یہ وہ درخت ہے جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے ۔ " (بنی اسرآئیل ٦)

مگر " جنّت " والے اس " مخصوص درخت " کی تو قرآن میں کہیں پر بھی مذمّت تک نہیں کی گئی ہے ۔ حالانکہ اس " جنّت " والے " مخصوص درخت " کو زیادہ مردود و ملعون قرار پانا چاہیئے تھا، کیونکہ " جہنم " والے " مخصوص درخت " سے کھانا کوئی " نافرمانی " نہ ہوگی اور اس کا اثر " افراد " تک محدود ہوگا، برخلاف اس کے اس " جنّت " والے " مخصوص درخت " کھانے نے تو بلا استثناء پوری انسانیّت کو ہمیشہ کے لئے پریشانی و محنت کشی کے عذاب میں گرفتار کرادیا ۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ " جہنّم " والے " مخصوص درخت " کا تو قرآن نے " نام " بتا دیا ہے کہ یہ " سینڈھ " کا درخت ہے، اور اس کے بارے میں یہ بھی تصریح کر دی ہے، کہ وہ گناہ گاروں کی خوراک ہوگا ۔ اور اس کے لئے کھانے کا لفظ لایا گیا ۔

(١) اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِيْمِ " وہ درخت سینڈھ کا ہے، گنہگاروں کی خوراک ہے ۔ " (دخان ٣)

لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ (واقعہ ٢) " سینڈھ کے درخت سے کھانا ہوگا ۔ "

(۳) لَیْسَ لَھُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ ۔ بجز ایک خار دار جھاڑی کے اُن کی خوراک کچھ اور نہ ہوگی ۔" (حاشیہ ۱)

اس طور پر اس "جنّت" والے "مخصوص درخت" کا بھی نام مندرج قرآن ہونا چاہیئے تھا اور اس مخصوص درخت کو بھی جنّتیوں کی خوراک ہونا چاہیئے تھا مگر یہاں ٹھیک اُلٹا ہے کہ "آدم" نے "کھانا" تو درکنار ذرا سا "چکھ" جو لیا تو "جنّت" سے محروم کر کے زندگی بھر کے لئے نکال باہر کر دیئے گئے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ واقعی کوئی "درخت" نہ تھا ورنہ جس طرح "دوزخ" کے مخصوص درخت کا نام "قرآن" نے بتا دیا ہے اُسی طرح "جنّت" کے بھی اس مخصوص درخت کا نام قرآن ضرور بتا دیتا ۔ اور جس طرح جہنّم والے "درخت" کو جہنّمیوں" کی غذا بنایا گیا ہے ، اُسی طرح اس جنّت والے درخت کو جنّتیوں کی بطور خاص غذا ہونا چاہیئے تھا ۔

دراصل چونکہ قصّۂ آدم میں "کھانے" کے ذکر کے بعد ہی "قربتِ شجرہ" کی ممانعت کا ذکر تھا ، اس لئے بلا تکلّف یہ سمجھ اور مان لیا گیا کہ یہ کوئی "درخت" ضرور ہی تھا ۔ حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ "ھٰذِہٖ" کے اشارۂ قریب کے باوجود نہ تو "شجر" (درخت) کا لفظ آیا ہے اور نہ کسی "درخت" کا "پھل" کھانے کی ممانعت ہے ، لہٰذا یہ واقعی کوئی "درخت" نہیں ہو سکتا ۔ قرآن میں صاف کہا گیا ہے کہ "قربتِ شجرہ" کی ممانعت کی گئی تھی پھر اگر واقعی یہ کسی "درخت" کا پھل کھانے کی ممانعت ہوتی تو "لَا کُلَا" آتا نہ کہ "لَا تَقْرَبَا" ۔ "کھانے" کی ممانعت بالعموم "قرآن" میں یوں آئی ہے :-

(۱) لَاتَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ (نساء ۱) "ان کے مال مت کھاؤ"

(۲) لَاتَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا (ال عمران ۱۴) "سود مت کھاؤ"

(۳) لَاتَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ "ان کو مت کھاؤ جن پر اللہ کا عَلَيْهِ (انعام ۱۴) کا نام نہ لیا گیا ہو"

اور جہاں "قربت" کی ممانعت کی گئی ہے، وہاں زیادہ تر یوں فرمایا گیا ہے:۔

(۱) لَاتَقْرَبُوا الزِّنٰٓى (بنی اسرائیل ۴) "زنا کے قریب بھی مت جاؤ"

(۲) لَاتَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۔ "حائضہ عورتوں سے قربت مت کرو، جب تک کہ وہ صاف ستھری نہ ہولیں" (بقرہ ۲۸)

(۳) لَاتَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ (انعام ۱۹) "فواحش کے قریب بھی مت جاؤ"

ظاہر ہے کہ اگر واقعی وہ کوئی "درخت" تھا جس کا "پھل" ممنوع قرار دیا گیا تھا تو "کھانے" کی ممانعت کی جاتی نہ کہ "قربت" کی۔ دوسرے جب "درخت" تھا تو اس کے "پھل" کا ذکر کیوں نہ کیا گیا؟ سورۂ ابراہیم (رکوع ۴) یا سورۂ بقرہ ۳۶ یا دوسری جگہوں پر جب "درخت" کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کے "پھل" (اُكُلَهَا) کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

"آدم" علم الاسماء کے واقفکار تھے وہ خود بھی جانتے ہی ہونگے کہ کس "درخت" کے "پھل" میں کیا خرابی ہے؟ اس لئے وہ خود بھی پرہیز کرتے، اور ممانعت کے بعد تو قطعاً کرتے۔ کیونکہ بہت سی چیزیں ہیں جن کو علم کے بعد، انسان نہیں کھاتا۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ واقعی یہ کوئی "درخت" نہ تھا ورنہ اس کے "پھل" کا ذکر ضرور کیا جاتا ——— اس قصہ میں ایک تو لفظ "شجر" نہیں آیا ہے

دوسرے "شجرہ" سے مُراد واقعی کوئی "درخت" یوں بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ اوّل تو جنّت میں کوئی "شجرِ ممنوعہ" ہے ہی نہیں جیسا کہ پہلے یہ آیت پیش کی جا چکی ہے:۔

فَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ لَا مَقْطُوعَةٍ وَّ "اور وہاں بہت سے میوے ہیں جو نہ تو مقطوع، لَا مَمْنُوعَةٍ (واقعہ ۱) (ختم ہونیوالے) ہیں اور نہ ممنوع (جن سے روک دیا گیا) ہو

دوسرے اگر حقیقتاً یہ کوئی کھانے کی چیز ہوتی تو بھی اس میں کوئی استثناء کی جاتی۔ جب "اولادِ آدمؑ" پر ساری "حرام" چیزیں اضطراری حالت میں "حلال" قرار دی گئی ہیں اور کہا گیا ہے کہ اضطراراً اُن کے استعمال پر کوئی باز پرس نہ ہوگی، اُس کا کھا لینا نافرمانی میں شمار نہ کیا جائے گا، اُس کی سزا نہ دی جائے گی، تو پھر "آدمؑ" کے معاملہ میں کیا قباحت تھی کہ اضطراری حالت میں بھی اُس کا کھانا اُن کے لئے جائز نہیں قرار دیا جاسکتا تھا؟ پھر "آدمؑ" اور اُن کی "بیوی" نے تو "کھایا" بھی نہیں تھا بلکہ محض "چکھا" تھا۔ قرآن تخصیص کرتا ہے کہ:۔

ذَاقَا الشَّجَرَةَ (اعراف ۲) "دونوں نے شجرہ کا مزہ چکھا"

اگر واقعتاً یہ کسی "درخت" کا معاملہ ہوتا تو "ذَاقَا الشَّجَرَةَ" کبھی نہ آتا کیونکہ "آدمؑ" اور اُن کی "بیوی" نے فی نفسہٖ "درخت" کو تو چکھا نہیں ہوگا بلکہ اُس کا "پھل" چکھا ہوگا مگر یہاں "شجرہ" ہی کے چکھنے کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ نے "کھانے پینے" کی چیزوں کا اپنے بندوں پر احسان یوں دھرا ہے:۔

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهٖ "اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اسکے ذریعہ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ (بقرہ ۳) اس نے اپنے بندوں کے لئے پھلوں کی غذا نکالی" پانی برستا ہے تو اس سے پہلے "درخت" پیدا ہوتے ہیں اور پھر ان "درختوں"

ہیں جو " پھل " لگتے ہیں وہ " غذا " بنتے ہیں، بھلا جو اللہ " کھانے پینے " کے معاملے میں " درخت " کا ذکر کئے بغیر " پھلوں " کی غذا کا " اولادِ آدم " سے ذکر کرتا ہے، وہی خدا " آدم " پر اگر کسی " درخت کا پھل " ممنوع قرار دیتا، تو اس " درخت " کا نام بتا کے اس کا " پھل " چکھنے اور کھانے سے منع نہ کرتا بلکہ " درخت " ہی کو " چکھنے " سے منع کرتا؟ بھلا کوئی انسان، " درخت چکھتا " ہے؟ یا آدمی " درخت کا پھل کھاتا " ہے؟ یہ " درخت " اور " چکھنے " کے لفظ ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الحقیقت یہ کوئی " درخت " نہیں ہے، بلکہ کوئی اور چیز ہے جو " درخت " کی نوعیت کی ہے، اور مزے دار بھی ہے، مگر فی الحقیقت " درخت " نہیں ہے۔

غالباً فی نفسہٖ لفظ " ذائقہ " کی وجہ سے بھی لوگوں نے سمجھا کہ یہ کوئی درخت ہی ہے جس کا " پھل " " آدم " اور اُن کی " بیوی " نے چکھا ہوگا۔ بلاشبہ " ذائقہ " کے معنی ازروئے لغت " مزہ چکھنے " کی اُس قوّت کے ہیں جو " زبان " میں ہے۔ اس لئے لوگوں نے یہاں لفظ " ذائقہ " دیکھ کر یہ خیال کیا ہوگا اس کا تعلّق زبان ودہن اور خوراک سے ہے۔ مگر لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ لغت، نزولِ قرآن کے بعد بنا ہے، اور قرآن نے لفظ " ذائقہ " کو اصطلاحاً اور محاورتاً محض " مزہ چکھنے " کے معنی میں بھی آزادی سے استعمال کیا ہے۔ " زبان " کی تخصیص نہیں بلکہ احساس وادراک سے بھی، جو لذّت والم محسوس ہو اُس کو " مزہ چکھنے " سے تعبیر کیا ہے " جنّتیوں " کے متعلّق ہے کہ:-

لَا یَذُوقُونَ فِیہَا الْمَوْتَ (دخان ۳) " وہ وہاں موت کا مزہ نہ چکھیں گے۔"

اور دوزخیوں کے متعلق ہے :۔

لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا (نباء ۱) " وہ اس میں نہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ کسی اور پینے کی چیز کا "

قیامت میں دوزخیوں کے متعلق حکم ہوگا کہ :۔

ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِیْمِ ۝ ذُقْ (دخان ۳) " پھر اس کے سر پر کھولتے ہوئے پانی کا دکھ ڈالو کہ لے چکھ "

ذرا پڑھتے تو غور بھی کرتے جائیے کہ " چکھنے " کا لفظ کس کس موقع سے اور کس کس محل پر آرہا ہے، ؟ ان میں سے کسی " چکھنے " کا تعلق، لب و دہن سے نہیں ہے اور سنئے " دوزخیوں " سے کہا جائے گا کہ :۔

(۱) ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ (سجدہ ۲) " دوامی تکلیف کا مزہ چکھو "

(۲) ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ (سبا ۵) " عذاب دوزخ کا مزہ چکھو "

اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ ایک بستی کے لوگ پُر امن اور فراغتِ روزی کی زندگی گزار رہے تھے مگر جب انھوں نے اللہ کے احسانات کی ناشکری شروع کی :۔

فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ ۔ (نحل ۱۵) " تو اللہ نے ان کو بھوک اور خوف کے لباس کا مزہ چکھا دیا "

یعنی " مزہ چکھایا " یہ کہ، جس طرح انسان کے لئے " لباس " ایک نہایت اہم اور ضروری ولابُدی ضرورتِ زندگی ہے، اُسی طرح بھوک اور خوف کو اُن کا " لباس " یعنی لازمۂ حیات بنا دیا گیا ۔

بھلا جب موت، تکلیف، خوف اور پیاس اور سر پر پانی ڈالے جانے کے احساس وادراک کے لئے "مزہ چکھنا" آیا ہے تو پھر کیوں یہ ضرور ہی سمجھ لیا جائے کہ "قصۂ آدم" میں جو "مزہ چکھنے" کا ذکر ہے اس سے مُراد کچھ "کھانا" ہی ہے اور اس کا تعلّق "زبان" اور "دہن" سے ضرور ہی ہے؟ کیا کوئی اور ایسا فعل نہیں ہوسکتا جس کا تعلّق "زبان ودہن" سے مطلقاً نہ ہو مگر اس کے باوجود اس کے متعلّق یہ کہا جائے کہ انھوں نے "مزہ چکھا"؟

"نسل" کے سلسلے کو "رشتہ ناطہ" کہا جاتا ہے اور "اولاد" بھی۔ قرآن نے "آدم" کے سلسلے میں "نسل" کا بھی ذکر کیا ہے:۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ (سجدہ ۱۵) "پھر ہم نے اس کی نسل کو حقیر پانی کے خلاصہ سے بنایا"

اسی کو "نسب" بھی کہا جاتا ہے، قرآن میں ہے:۔

(۱) خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَّصِهْرًا (فرقان ۵) "پانی سے آدمی کو پیدا کیا پھر اس کے رشتے ناطے بنائے اور اسکو سسرال والا کیا"

دیکھئے پیدائش کے بعد، اس کے خاندان کے پھیلنے کو "نسب" کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے:۔

(۲) وَجَعَلُوْا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (صٰفٰت ۵) "اور مشرکوں نے خدا اور جنّوں کے درمیان رشتہ ناطہ قرار دیا ہے"

(۳) فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ "اور صور پھونکا جائیگا تو اس دن اُن میں

بَیْنَهُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ " رشتے ناطے باقی نہ رہیں گے اور نہ کوئی بھی کسی کو پوچھے گا " (مومنون ۶)

اسی طرح مجازاً یا عام محاورہ میں " نسلی سلسلے " اور " خاندانی پھیلاؤ " اور " نسب نامے " کو " شجرہ " بھی کہتے ہیں، اس لئے کہ اس کی نوعیت اور شکل بھی بالکل " درخت " کی سی ہوتی ہے جس طرح ایک " بیج " سے ایک " درخت " جڑ پکڑتا ہے اُسی طرح ایک " فرد " سے ایک " خاندان " کی بنیاد پڑتی ہے۔ پھر جس طرح " درخت " بڑھ کر بے شمار شاخوں، ٹہنیوں اور پتوں کی شکل میں پھیل کر ایک تناور درخت بن جاتا ہے اُسی طرح وہ خاندان بھی لاتعداد افراد، بیٹوں، پوتوں اور پرپوتوں کی شکل میں پھیل کر " شجرہ " کی صورت اختیار کر لیتا ہے، چنانچہ علامہ غلام احمد پرویز نے " انبیاء " کا جو " نسب نامہ " اور " شجرۂ طیبہ " اپنی کتاب " معارف القرآن " کی جلد دوم صفحہ ۳۴۴ اور جلد سوم کے صفحہ ۲ پر درج کیا ہے، اُس کے سرنامے پر حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا ذکر شروع کرنے سے پہلے، سورۃ " ابراہیم " کی یہ بلیغ و ذو معنی آیت درج کی ہے :-

كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا " کہ وہ مشابہ ہے ایک شجرۂ طیبہ کے، کہ ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ جس کی جڑ زمین میں گڑی ہو اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں " (ابراہیم ۴)

حقیقت یہ ہے کہ انسانی " شجرۂ طیبہ " اور " شجرۂ مثمرہ " میں بڑی یکسانیت ہے کیا بہ اعتبار نوعیت اور کیا بہ لحاظ معنویت۔

" ہنری بسٹالونسی " (وفات ۱۸۲۶ء) تہذیبِ نظامِ درس کے عوامل محرکہ

میں پہلا شخص تھا، اس نے "تعلیم" پر بہت کچھ لکھا ہے، اس کی ایک عبارت یہ ہے:۔

"درخت" کس چیز سے پیدا ہوا ہے؟ ایک ننھے اور حقیر سے بیج نے اس کو "درخت" بنایا ہے! جو درخت کے افعال و خواص پر حاوی ہے، اور جو اس وقت خاک میں چھپا ہوا ہے، "انسان" بھی اسی "درخت" کے مشابہ ہے، بچوں میں دیکھو، وہی قوتیں مخفی و مستور ہیں۔ جو اس کی زندگی میں نمایاں ہوتی ہیں، انسان کی تہذیب صرف ادبی و اخلاقی حالت کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں"

یہ عبارت علامہ ابوالکلام آزاد نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ "الہلال" مورخہ ۴ جون ۱۹۱۳ء (مضامین آزاد صفحہ ۱۹۱ جلد ۲) کے سرنامہ پر نقل کی ہے۔ یہ ماہرِ تعلیم "انسان" کو "درخت" کے مشابہ بتاتا ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ "مشرق" ہی نہیں "مغرب" میں بھی یہ مانا ہوا ہے کہ "نسلِ انسانی" کو "درخت" سے بڑی مشابہت ہے، یہی وجہ ہے کہ "شجرہ" صرف "درخت" ہی کو نہیں کہتے بلکہ نسلِ انسانی کے "نسب نامے" اور "خاندانی سلسلے" کو بھی "شجرہ" کہا جاتا ہے، آج "سائنس" نے تو یہ بات راز نہیں رہنے دی ہے کہ "انسان" اور "درخت" میں یوں بھی بڑی مشابہت ہے۔ جس طرح "درخت" کی ترکیب خلیوں (Cells) سے ہوتی ہے اسی طرح "جسمِ انسانی" کی ترکیب بھی "خلیوں" ہی سے ہوتی ہے۔ جس طرح "انسان" کی تخلیق دو بلند و پست ذات کے اتصالِ جسمانی سے ہوتی ہے اسی طرح ہر "درخت" کی بیج میں دو گرہیں سی ہوتی ہیں جن میں سے ایک "ڈنڈی" بن کر باہر نکلتی ہے، دوسری

"جڑ" بن کر زمین میں پیوست ہوجاتی ہے۔ جس طرح "انسان" کہلاتے، جیتے سانس لیتے، نشو و نما حاصل کرتے، بچے پیدا کرتے، کشمکشِ حیات میں اُلجھتے، ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں، ویسے ہی "درخت" بھی یہی سب کچھ کرتے ہیں۔ جس طرح "انسان" کی تخلیق بغیر "مٹی" کے نہیں ہو سکی اسی طرح "درخت" بھی مٹی کے بغیر نہیں ہوتا۔ اس لئے "انسانی نسل" کو "شجرہ" سے تعبیر کرنا کچھ عجوبہ نہیں ہے۔ "شجرہ" بہ معنی سلسلہ نسل و خاندان، عام طور سے نظم و نثر اردو میں بھی مستعمل ہے، اگر ناسخ کے اس شعر سے "ادبی دنیا" کے بے شمار، لوگوں کے کان آشنا ہیں:- ؎

گر سلسلہ ہے گیسوئے مشکینِ یار کا

بے سایہ سرد "شجرہ" ہوا میرے پیر کا

تو "مذہبی" دنیا کے لئے بھی "شجرہ" بہ معنی سلسلۂ نسب نامانوس نہیں ہے۔ محسن کاکوروی کے مشہور نعتیہ قصیدہ:- ع

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

کو، ہر اُس شخص نے ضرور پڑھا ہے جو "نبی آخر" محمد رسول اللہ سے محبت کا دعویدار ہے اور اس قصیدے میں یہ شعر بھی ہے:- ؎

"شجرہ" پیر مُغاں میں نکل آئیں شاخیں

حُرمتِ دخترِ رز میں نظر آتا ہے خلل

"خانقاہی" دنیا میں تو خاندانی اور نسبی سلسلہ کے لئے لفظ "شجرہ" اتنا عام ہے کہ ہر شخص اس سے واقف ہے۔ ابھی اکتوبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئے خانقاہی رسالہ "آستانہ"

(دہلی) کے صفحہ ۱۸۱ پہ سلسلۂ "چشتیہ صابریہ فاروقیہ" کا منظوم "شجرۂ نسب" شائع ہوا ہے، جس میں ہر نسل کا سلسلہ وار ذکر آنحضرت سے شروع ہو کر، عہدِ جدید کے گدی نشین پر ختم ہوتا ہے۔ اس نظم کا عنوان یہ ہے:۔

"شجرۂ عالیہ چشتیہ صابریہ فاروقیہ"

"خانقاہوں" میں جو کتابیں گدی نشینوں اور ان کے سلسلے متعلق لکھی جاتی ہیں ان میں بھی لفظ "شجرہ" سلسلۂ نسب اور خاندان کے لئے عام طور سے مستعمل ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء میں "خانقاہ پھلواری شریف" سے متعلق جو تاریخ "اعیانِ وطن" کے نام سے شائع ہوئی ہے اس کے مقدمہ میں علامہ مناظر احسن گیلانوی نے مرتب کو داد دی ہے کہ:۔

"معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ، بیسیوں "شجرہائے نسب" کے مطالعہ کے بعد، کتاب کے مصنف جلیل نے جمع کر دیا ہے" (صفحہ ۲۰)

"قرآن" فصاحت و بلاغت ہی نہیں، ادب و شائستگی اور تہذیب و متانت کی بھی آخری حدود سے ارفع و بلند ہے، وہ کسی "پردہ" کی بات کو عریاں اور ناگوار طریقہ پر، بدتمیزی سے نہیں بیان کرتا۔ شرافت کی جو آخری حد ہے وہاں پہنچکر بھی وہ اس طرح نہیں کھلتا کہ بات بے کیف یا صریحاً بے پردہ ہو جائے۔ بلکہ عریاں سے عریاں مسئلہ کو بھی اس نفاست، لطافت اور شائستگی سے ادا کرتا ہے کہ زبان و بیان کو خود مزہ آجائے۔ قرآن نے "نسلی سلسلہ" کو جس پر حیاتِ انسانی کی بنیاد ہے اور جس وجہ سے لوگ بھی اُسے "شجرِ انسانیت" کہتے ہیں، غایت نفاست و لطافت کیساتھ محض لفظ "شجرہ" سے ظاہر کیا ہے۔ جس میں ایک لطیف مشابہت و

مماثلت کا بھی پہلو موجود ہے اور حقیقت و صداقت کا بھی عنصر داخل ہے، کیونکہ واقعی " انسان " اور " درخت " میں ہر طرح کی مشابہت و مماثلت ہے۔ دونوں کی نوعیت ایک سی ہے۔ دونوں کا اندازِ حیات ملتا جلتا ہے۔ اور چونکہ یہ " شجرہ " یعنی " نسلی سلسلہ " اُن کے بس کا تھا اسی لئے " ھٰذِہٖ " کا اشارۂ قریب استعمال کیا گیا۔ " انسان " اور " درخت " کے باہم مشابہ ہونے کا اس سے زیادہ اہم ثبوت اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے کہ خود قرآن فرماتا ہے

وَاللّٰہُ اَنْبَتَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا " اور اللہ نے تم کو زمین سے اُگا!

(نوح ۱) یا ایک طرح کا اُگانا "

اور سورۂ حج (رکوع ۱) میں " انسان " اور " نباتات " کی تخلیق کا ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ " آدم " نے " نسلِ انسانی " کی بنیاد رکھی، انھوں نے ایک " درخت " کے مثل " زمین " میں مضبوط جڑ پکڑی اور پھر اُن کی " اولاد " ایک مضبوط تناور درخت کی لاتعداد شاخوں کی طرح دنیا میں پھیلی اور پھیلتی ہی جارہی ہے، اب تو اس کی شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ لہذا قصۂ آدم میں " شجرہ " سے مراد واقعی کوئی " درخت " نہیں بلکہ " نسلی سلسلہ " ہے جس کے ظہور پر " نسلِ انسانی " کا مدار اور جس کی " قربت " پر " خاندانِ آدم " اور انسانی " شجرہ " کے وجود میں آنے کا انحصار ہے خدارا " ھٰذِہِ الشَّجَرَةَ " پر صرف غور کیجیے، اس کے حسن اور بلاغت کو وضاحت و تفصیل، مجروح کر دیگی قرآن تہذیب و تمیز اور اخلاق و شائستگی کا نادر لوجود پیکر ہے، وہ اس مسئلہ کو عریاں طریقہ پر نہیں بیان کر سکتا تھا، کہا گیا کہ اے آدم! یوں تو جو دل میں آتے وہ کرو

مگر یہ جو "شجرہ" ہے نا اس کی "قربت" سے پرہیز کرنا، اسی لئے قرآن میں "نام" نہیں آیا ہے بھلا جب واقعی کوئی "درخت" ہو تب تو اس کا "نام" بھی لیا جائے؟ یہاں تو مقصود یہ تھا کہ آدم "قربتِ شجرہ" سے تھوڑے دن پرہیز کریں، دونوں میاں بیوی کچھ عرصہ جنسی تعلّق قائم کرنے سے باز رہیں یعنی سرِدست کچھ دن اور صبر کریں۔ "قربتِ شجرہ" سے منع کرنیکا مطلب صرف یہی تھا کہ آدم اور انکی بیوی "جنسی ملاپ" اور "نسلی تعلقات" فوراً نہ قائم کریں۔ اور اسی لئے آگے کے بعد "کھانے" کا نہیں بلکہ "مزہ چکھنے" کا لفظ آیا ہے۔ ذرا پھر غور فرمائیے۔ "آدم" اور اُن کی "بیوی" کو، یعنی ایک "مرد" اور ایک "عورت" کو، ایک ایسے باغ میں رکھا گیا تھا جو بہترین ماحول اور دلکش فضا کا حامل تھا اور وہاں انھیں بہترین غذائیں بھی بے محنت و مشقّت مل رہی تھیں، کوئی کام بھی کرنیکو تھا ہی نہیں۔ اس کا لازمی اور فطری نتیجہ کیا تھا؟ یہی کہ دونوں "جنسی تعلّق" قائم کرلیں۔ اور مشیّت ابھی اِس کو مناسب نہ سمجھتی تھی کہ وہ دونوں اس تعلّق کو جلد قائم کرلیں، لہٰذا اُن سے کہا گیا کہ یہاں رہو بھی، جو دل چاہے اور جہاں سے جی چاہے دونوں میاں بیوی خوب خوب کھاؤ پیو بھی، مگر دیکھو "قربتِ شجرہ" نہ ہونے پاتے، اُن سے ایک عہد لیا گیا کہ تم دونوں "جنسی تعلّق" نہ قائم کرنا ورنہ اِس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ سلسلۂ توالد و تناسل" قائم ہو جائے گا اور اگر ایسا ہو گیا تو تم دونوں کی یہ بے محنت و مشقّت والی، سُہانی و رومانی، فکر و تردّد سے نا آشنا اور جنّت آسا و آرام دہ زندگی ختم ہو جائے گی، تم بال بچّوں اور اُن کے لئے کمانے کھلانے کی مصیبتوں میں پھنس جاؤ گے، اور یہ مصیبت تمہاری اپنی

ہی لائی ہوئی ہوگی تم اپنا نقصان آپ کر لینے والوں میں سے ہو جاؤگے ۔ "المفردات" میں الراغب الاصفہانی (وفات ۵۰۲ھ / ۱۱۰۸ء) نے "ظلم" کے معنی بتاتے ہیں "ایک چیز کا اس کے مقام سے جو اس کے لئے خاص ہے ہٹا کر دوسری جگہ رکھنا"، یہ معنی یہاں پر زیادہ چسپاں ہوتے ہیں۔ مگر ہر چیز کا ایک قاعدہ ہے۔ "برہان قاطع" مولفہ مرزا غالب دہلوی فارسی زبان کے لئے سند نہیں مانی جاتی، اس لئے کہ مرزا صاحب ایرانی النسل نہیں بلکہ ہندی النسل ہیں، تو عربی قرآن کے لئے مفردات کو کون سند مانے گا، جب کہ اصفہانی صاحب عربی النسل نہیں بلکہ عجمی النسل ہیں[1]؟ خود قرآن کا بھی یہی معیار ہے فرمایا گیا ہے کہ اگر ہم عربی رسول پر "عجمی قرآن" نازل کرتے تو اعتراض ہوتا کہ :-

ءَاَعْجَمِیٌّ وَّ عَرَبِیٌّ (حم سجدہ ۵) "یہ کیا بات کہ عجمی کتاب اور عربی رسول؟"

میں بھی اگر قرآن کے لئے "مفرداتِ راغب" کو سند بتاؤں گا تو اہلِ علم حضرات اعتراض کریں گے کہ :- "یہ کیا بات کہ عربی کتاب" اور "عجمی لغت نویس"؟

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا لغت خود قرآن ہی ہے۔ اور علامہ آزاد کے لفظوں میں "وہ اس بارے میں بھی قرآن اپنے سے باہر کا ابداً محتاج نہیں[2]"۔ قرآن میں ظلم کا لفظ یہاں بھی دوسروں کیلئے آیا ہے وہاں بالعموم اپنا آپ نقصان کر لینے ہی کے معنی میں آیا ہے اسی لئے میں نے قرآنی مفہوم ہی کو سند مانا اور پیش کیا ہے۔ بہر کیف! اصل یہ ہے کہ حسب خواہش "کھانے پینے" کی اجازت کے بعد ہی "قربتِ شجرہ" کی ممانعت کا ذکر آجانے سے لوگوں نے سمجھا کہ واقعی یہ کوئی "درخت" ہے جس کا پھل کھانے سے "آدم" کو اور ان کی "بیوی" کو

[1] خود ملک عجمی کا اعتراف سن لیجئے، جامی فرماتے ہیں: "بہ پیش شہر گو جامیا حکایت عشق" "مجوے از عجمی" فہم نکتۂ عربی"

[2] "ہم قرآن کی سورتوں میں سے بڑے سے بڑی سورہ کو بغیر لغت کی کتابوں کی طرف کسی غیر معمولی احتیاج کے، زبان کے اعتبار سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں"۔ ("الادب الجاہلی" صفحہ ۱۴۷ ڈاکٹر طٰہٰ حسین ترجمہ ...)

منع کیا گیا تھا۔ حالانکہ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ "قربتِ شجرہ" یا "جنسی تعلق" کا انحصار خورد و نوش اور آب و غذا پر ہے :۔ ع

ایں فسادِ خوردنِ گندم بود

روٹی تک ہی نہ ملے تو جنسی تحریک کیا ہوگی ؟ اور بے محنت و مشقت عمدہ غذا کھانے والے "جنسی تعلق" کے جیسے دلدادہ ہوتے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ برخلاف اس کے جس کو غذا نہ ملے اور اُس کے پیٹ میں کچھ نہ پڑا ہو تو پھر وہ بے چارا ادھر خیال بھی نہیں کر سکتا اور نہیں کرتا ہے۔

"قحط سالی" کے زمانے میں "دمشق" کے لوگ جو "عشق کو فراموش" کر بیٹھے تھے اس کی وجہ بھی محض یہی تھی کہ بھوک اور پریشانی میں جنسی جذبات نہیں اُبھرتے۔ آج بھی عشق و محبت کے دعویداروں کو آپ دیکھیں گے کہ مالی پریشانیوں کے وقت سارا عشق بھلا دیتے ہیں، بہرکیف ! "جنسی جذبات" کا مدار صرف آب و غذا پر ہے۔ لہذا یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ چونکہ "کھانے پینے" کی اجازت کے بعد "قربتِ شجرہ" ممنوع قرار دیا گیا ہے، لہذا "شجرہ" حقیقتاً "درخت" ہی کو کہا گیا ہے "کھانے پینے" کے ذکر کے بعد "عورت سے جنسی و جسمانی تعلق" کا ذکر قرآن کے لیے کچھ نامانوس اندازِ بیان نہیں ہے، جس طرح "آدم" کو مخاطب کر کے "کھانے پینے" کی عام اجازت دی گئی تھی اور اس کے بعد ہی "جنسی تعلق" قائم کرنے سے، عارضی طور پر، اُن کو منع کر دیا گیا تھا، اُسی طرح رمضان شریف کے مُعتکف مسلمانوں کو "کھانے پینے" کی عام اجازت دی گئی ہے، مگر اس کے ساتھ ہی اُن کو عورت سے "جسمانی اتصال" اور "جنسی تعلق"

قائم کرنے سے، عارضی طور پر منع کیا گیا ہے :-

کُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ " شوق سے کھاؤ پیو اس وقت تک
الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ کہ تم کو سفید خط صبح کا، رات کے سیاہ
مِنَ الْفَجْرِ، ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ خط سے نمایاں ہو جائے، پھر اس
اِلَی الَّیْلِ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ وقت سے لے کر رات تک روزے
اَنْتُمْ عَاکِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ کو پورا کرو اور اپنی بیویوں سے قربت نہ
تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا۔ کرو جبکہ تم مسجد میں اعتکاف کئے ہوئے ہو
(بقرہ ۲۳) یہ اللہ کی مقرر کردہ حد ہے سو تم اس کے قربت نہ کرنا"۔

غور فرمایئے یہ ایک ہی آیت ہے اور اس میں اعتکاف کی صورت میں عورت سے قربت کرنے کی ممانعت ہے، مگر اس سے پہلے " کھانے پینے " کی عام اجازت ہے، اور اگر " آدم " کے ذکر میں " کلا " اور " لا تقربا " آیا ہے تو یہاں بھی " کلوا " اور " لا تقربوا " آیا ہے۔ اس آیت کو یہاں پیش کرکے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ " کھانے پینے " کے ذکر کے بعد " لا تقربا " کو کھانے کا درخت ہی سمجھنا، غلط ہے۔ دراصل قصۂ آدم میں " شجرہ " سے مراد " نسلی سلسلہ " اور قربتِ شجرہ " کا مطلب بجز " جنسی تعلق " اور " اتّصالِ جسمانی " کے اور کچھ نہیں۔ آیئے ذرا واقعات اور الفاظ پر ایک سرسری نظر ڈال کر بھی اس اجتہاد کو جانچ لیجیے ___

قُلْنَا یٰاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ " ہم نے کہا کہ اے آدم! تم بھی اور تمہاری

الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِينَ ۔ (بقرہ ۴)

بیوی بھی دونوں اس باغ میں رہو
اور جہاں سے، جو دل چاہے وہ کھاؤ پیو،
مگر یہ جو شجرہ ہے اس سے قربت نہ کرنا ورنہ تم بھی
آپ پر ظلم کر لینے والوں میں سے ہو جاؤ گے "

" آدم " اور ان کی بیوی " ٹھاٹھ سے رہنے سہنے لگے مگر " آدم " انسان تھا اور

(۱) خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيفًا (نساء ۵) " انسان تو خلقی طور پر کمزور ہے "

(۲) وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِي عُنُقِهٖ (بنی اسرائیل ۲) " اور ہم نے ہر انسان کی شامت کو اس کے گلے سے باندھ دیا ہے "

ایک تو خود کمزور، دوسرے شامت گلے کا ہار، تیسرے اندر باہر جگہ دشمن ہی دشمن، ایک تو اپنا نفس ہی انسان کا دشمن، لہذا جی میں وسوسے آنے لگے طرح طرح کے خیالات " آدم " کے دل میں سمانے لگے :-

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ (ق ۲) " اور ہم ہی نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ اسکا نفس اسکے جی میں کیا کیا وسوسے ڈالتا ہے "

مگر صرف اندرونی خلش انسان کو صحیح راستہ سے ہٹا دینے کے لئے کافی نہیں۔ کسی فعل کا وقوع انسان سے، بغیر خارجی تحریک کے ممکن ہی نہیں ہے " شراب " میں اگر نشہ ہے تو " بوتل " کیوں نہیں ناچنے لگتی ؟ ۔ اور اگر " انسان " کی طبیعت ہی میں شرارت ہے تو وہ بغیر " مے " پئے، کیوں نہیں بہکتا ؟ تو ظاہر ہوا کہ جس طرح " انسان " کو بہکانے کے لئے خارجی چیز " شراب " کی ضرورت ہے اسی طرح شراب کی خاصیت کے ظہور کے لئے بھی ایک خارجی چیز یعنی " انسان کا پیٹ "

چاہئے۔ فطرتِ انسانی، بالکل صاف ہے اور اس کے خلاف انسان کے جسقدر بُرے اعمال ہیں ان کو خارجی اثرات کی پیدا کی ہوئی ضلالت سمجھتے اور ہر ایسی ضلالت کو جو شرفِ انسانی کے خلاف ہے، قرآن " عمل الشیطٰن " سے تعبیر کرتا ہے لہٰذا " آدم " کی اندرونی خلش کو، جو دشمنِ اول " نفس " کی پیدا کی ہوئی تھی خارجی دشمنِ ثانی " شیطان " کے وسوسے سے شہ ملی، یہ " انسان " کا دوسرا دشمن ہے۔ یہ شیطان نیک کام میں تو انسان کی مدد کرتا نہیں :-

وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ " شیطان انسان کو مدد دینے سے جواب
خَذُوْلًا (فرقان ۳) دے ہی دیتا ہے "

اس نے بھی وسوسہ اندازی شروع کر دی :-

(۱) اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (یٰسین ۴) " بلاشبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے "

(۲) فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ (طٰہٰ ۷) " سو شیطان نے اسکی طرف وسوسہ ڈالا "

داخلی وسوسہ نے، خارجی وسوسہ اندازی کی مدد حاصل کر کے استحکام پالیا چنانچہ " ابلیس " کے وسوسوں پر " آدم " نے کان دھر دیا۔ وہ مشفقانہ نصیحت کرنے لگا کہ :-

(۱) يٰاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (طٰہٰ ۷) " اے آدم! کیا میں تم کو " ہمیشگی " والا درخت بتلا دوں اور تمہیں ایسی بادشاہت کا پتہ دوں جس میں کبھی زوال نہ آئے "

(۲) مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا " تمہارے رب نے جو تم کو اس " شجرہ " سے روک دیا ہے وہ صرف اس لئے کہ کہیں تم فرشتے

مِنَ الْخٰلِدِیْنَ ۔ نہ بن جاؤ یا تمہیں کسی طرح دائمی زندگی

(اعراف ۲) نہ حاصل ہو جائے ۔"

ظالم نے یہ تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں تیری اِس چہیتی اور لاڈلی مخلوق کو اُکھاڑ پھینکوں گا ۔ اب ملاحظہ فرمایئے اُس کے مشورے کیا تھے ؟ :۔

(۱) " اس سے تم کو ہمیشگی حاصل ہو جائے گی، تمہارا نام ونشان کبھی نہ مٹے گا، تم اس طور پر غیر فانی ہو جاؤ گے، تمہارا ہمیشہ نام لینے والے پیدا ہو جائیں گے اس طرح گویا تم کبھی نہ مرو گے ۔"

(۲) " تم ایک ہی حالت پر ہمیشہ رہنے والے فرشتے بن جاؤ گے، تمہارا مرتبہ بہت بلند ہو جائے گا، تم کو فرشتوں کی طرح پیری نہ ستائیگی تم ایک لازوال زندگی پا لو گے ۔"

(۳) " تم کو بادشاہت ملے گی اور ایسی کہ جس میں کبھی زوال نہ آئے گا۔ تم بڑے لاؤ لشکر اور دولت واسباب کے مالک بن جاؤ گے اور ایسے کہ کبھی اس میں نقصان نہ ہوگا ۔"

یہ تینوں باتیں جو اُس نے سمجھائیں، ان کا مدار صرف "جنسی تعلق" اور اُس کے نتیجے میں "بقاءِ نسل" پر ہے ۔ "انسان" کی فطری خواہش یہ ہے کہ وہ "بقائے نسل" کے ذریعہ "حیاتِ دوام" حاصل کر لے ۔ وہ دولت و بادشاہت کا مالک ہو "انسان" کے نزدیک "اولاد" بھی بہت بڑی بادشاہت ہے اور "اولاد" کا اس لئے وہ خواہاں ہوتا ہے کہ اس طور پر اُس کی "نسل" چلے گی ۔ اور وہ "بقائے دوام" حاصل کر لے گا "شیطان"

نے سوچا کہ نسلِ انسانی کو خراب اور تباہ و برباد کر دینے کی بہترین صورت یہ ہے کہ آدم کو وقت سے پہلے ہی جنسی تعلقات پر آمادہ کر دو تاکہ کمسنی کی اولاد مریض و ناتواں ہونے کے سبب جلد مَر دھر کے ختم ہو جائے ۔ چنانچہ مردود نے "آدم" کو یہی سمجھایا اور سُجھایا کہ " قُربتِ شجرہ " کر لو تو اس سے تم کو " غیر فانی بادشاہت " اور " حیاتِ جاوداں " دونوں حاصل ہو جائے گی ۔ غور کیجیے کہ " شیطان " نے جو کچھ بتایا تھا وہ کسی " درخت کا پھل " کھانے سے " آدم " کو حاصل ہو سکتا تھا یا " جنسی تعلّق " پیدا اور قائم کر لینے سے ؟ پھر یہ بھی دیکھیے کہ شیطان کی یہ " وسوسہ اندازی " کا مآل کار کیا تھا ؟ اُس کی یہ ریشہ دوانی کاہے کو تھی؟ اس لئے اور صرف اس لیے تاکہ ایک پر دوسرے کا " ستر " کھُل جائے :۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ " سو شیطٰن وسوسہ اندازی کرنے لگا،
لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُرِيَ عَنْهُمَا تاکہ اُن پر ایک دوسرے کی شرمگاہیں
مِنْ سَوْاٰتِهِمَا (اعراف ۲) کھول دے "

سوچیے تو کہ " ابلیس " کی یہ خواہش اور غرض، دونوں یعنی " جنسی تعلّق " پیدا کرا دینے کی تحریص سے پوری ہو سکتی تھی یا کسی " درخت کا پھل " دونوں کو کھلا دینے کی ترغیب سے ؟ " جنسی تعلّق " ہی میں تو ایک دوسرے پر " ستر " کھُل سکتا ہے ۔ پھر کسی " درخت کا پھل " کھانے کے لیے یہ تو ضروری نہ تھا کہ " آدم " ہی پہلے کھاتے ؟ اُن کی " بیوی " بھی ابتدا کر سکتی تھیں، اور یہ بھی ممکن تھا کہ " آدم " کھاتے ہی نہیں اور اُن کی " بیوی " کھا لیتیں ، لہٰذا دونوں کو " اللہ " بھی الگ الگ منع کر سکتا تھا ۔ اور " شیطان " بھی جدا جدا

بہکا سکتا تھا۔ مگر آخر ایسا کیوں ہے کہ جب "اللہ تعالیٰ" نے بھی "قربتِ شجرہ" سے منع کیا تو "آدم" ہی کو مخاطب کر کے منع کیا اور جب "شیطان" نے بھی "قربتِ شجرہ" پر ابھارا اور اکسایا تو اُس نے بھی "آدم" ہی کو مخاطب کیا؟ صاف ظاہر ہے کہ یہ معاملہ کسی "درخت" کا پھل کھانے کا نہ تھا بلکہ "جنسی تعلق" کا تھا۔ چونکہ "جنسی تعلق" میں اقدام اور ابتداء "مرد" کی طرف سے ہوتی ہے؛ "عورت" کی جانب سے نہیں، لہٰذا جب اللہ تعالےٰ نے بھی "قربتِ شجرہ" کی ممانعت کی تو "آدم" ہی کو مخاطب کیا۔ اور جب شیطان نے بھی قربتِ شجرہ پر ورغلایا تو اُس نے بھی "آدم" ہی کو متوجہ کیا۔ ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں "آدم" کی "بیوی" کو مخاطب کر کے منع کرنا یا اُن کو ابھارنا بے معنی تھا۔ اگر "آدم" ہی اقدام نہ کرتے تو ان کی "بیوی" کیا کرتیں؟ البتہ چونکہ یہ فعل اجتماعی اور دونوں کا تھا اس لئے "آدم" کو مخاطب کرتے ہوئے ممانعت و بہکاوے دونوں میں "تثنیہ" کا صیغہ استعمال کیا گیا، بہر کیف! شیطان کے اشتعال و ترغیب یا وسوسہ اندازی سے متاثر و مغلوب ہو کر "آدم" بے قابو ہو گئے، اور "قربتِ شجرہ" کر ہی بیٹھے۔ یہاں پر غور کیجئے کسی "درخت" کا معاملہ ہوتا تو اُس ارتکاب کے ذکر میں "کھانے" کا لفظ بھی ضرور آتا۔ مگر ایسا نہیں ہے، چونکہ یہ "جنسی معاملہ" تھا۔ اس لئے "مزہ چکھنے" کا لفظ آیا ہے:—

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا ۔ "سو جیوں ہی دونوں نے اس شجرہ کا مزہ چکھا دونوں کی شرمگاہیں ایک دوسرے پر کُھل گئیں" (اعراف ۲)

بھلا یہ خصوصیت کسی " درخت " کا پھل کھانے " کی ہے یا " جنسی تعلق " کی ؟ کیا کسی " درخت " کے محض " چکھنے " سے ایک دوسرے پر " ستر کھلنا " آج تک آپ نے سنا ہے ؟ کوئی " پھل " ہوتا تو ایک کھاتا دوسرا نہیں ، یا دونوں کھاتے تو وقفہ سے کھاتے اور دونوں پر اس کھانے کا اثر بھی تدریجاً ، طبعی ، مناسبت سے اور مزاج کے مطابق مترتب ہوتا ۔ یا اگر " ستر " کھلتا بھی تو اپنی اپنی جگہ پر کھلتا نہ کہ ایک دوسرے پر ؟ یا " وقفہ " سے " ستر " کھلتا نہ کہ ایک ساتھ ؟ ۔ مگر ہوا یہ کہ جیوں ہی انھوں نے " قربتِ شجرہ " کیا دونوں کا " پردہ والا بدن " ایک دوسرے پر کھل گیا ۔ ظاہر ہے کہ ایسا تو " جنسی تعلق " ہی کے موقع پر ہوتا ہے ، اور بھلا اس میں کیا شک ہے کہ " جذبۂ شہوت " اور اس کا لازمی نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وسوسۂ شیطانی سے مغلوب و متاثر ہوکر ایک " مرد " اور ایک " عورت " ایک دوسرے پر اپنا " ستر " کھول دیں ۔ چنانچہ " آدم اور ان کی " بیوی " کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ۔ پھر جب دونوں کے جذبات فرو ہوئے اور انھوں نے لذّتِ شجرہ سے فراغت پائی تو وہی ہوا جو " تعلّقِ جنسی " کے بعد ہوتا ہے ، یعنی ایک دوسرے سے شرمانے لگے ، اپنی اپنی " برہنگی " سے خجالت محسوس کرنے لگے ، اسی احساسِ " برہنگی " کو قرآن نے ، اسی سورہ میں ذرا آگے بڑھ کر " لباس اتر جانے " سے بھی تعبیر کیا ہے :-

يَنزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْآتِهِمَا ۔ (اعراف ۳) " ابلیس نے ان دونوں کا لباس اتروا دیا تا کہ ان کا پردہ والا بدن ایک دوسرے پر ظاہر ہو جائے ۔ "

ظاہر ہے کہ آدم " اور ان کی " بیوی " کے جسم پر واقعی کوئی " لباس "
تو تھا نہیں۔ اگر تھا تو " تقویٰ کا لباس[ل] " تھا جو " عہد شکنی " اور " وعدہ خلافی "
سے اتر ہی چکا تھا، اب دونوں " پردہ پوشی " کریں تو کیونکر؟ چنانچہ :-

طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ " دونوں باغ کے " پتے " اپنے اپنے
وَّرَقِ الْجَنَّةِ (اعراف ۲) جسموں پر چپکانے لگے "

ملاحظہ فرمایئے، وہ لوگ " پتوں " سے بدن ڈھانکنے اور چھپانے لگے۔
اوّل تو کسی " درخت کا پھل " کھا کر " شرمانا " کیسا؟ " پردہ پوشی کی کوشش کرنا
کیا معنی؟ دوسرے یہ " پتے " ہوں گے تو اسی " درخت " کے جو
" ممنوعہ " تھا اور جس کے پاس دونوں کھڑے ہوں گے، اور جس کا انھوں نے
پھل " چکھا " ہوگا؟ کیونکہ اس کو " چکھنے " کے ساتھ ہی وہ " بے ستر " ہوئے
تھے، پھر جس " درخت " کی یہ خصوصیت ہو کہ محض اُس کے " چکھنے " سے کھانے
والے " بے ستر " ہو جائیں تو پھر اس " پردہ فاش " درخت کے " پتے "
بھلا " پردہ پوش " کیونکر ہو سکتے ہیں؟ اس سے ظاہر ہے کہ وہ کوئی " درخت "
ہرگز نہیں تھا جس سے " قربت " کرنے کو منع کیا گیا تھا، بلکہ " قربتِ شجرہ " سے
مُراد " جنسی تعلّق " تھا۔

[ل] متذکرہ بالا آیت سے قبل والی آیت ہے :-

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا " اے بنی آدم! ہم نے تمہارے لیے لباس اُتارا ہے جو کہ
يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ تمہارے پردے والے بدن کو بھی چھپاتا ہے اور موجب زینت
التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ (اعراف ۳) بھی ہے اور تقویٰ کا لباس اس سے بھی بہتر ہے "

دوسری چیز اس مقام پر قابلِ خیال یہ ہے کہ یہاں پر " پتوں " کے لئے " ورقِ الجنّۃ " آیا ہے ، ظاہر ہے کہ " پتے " تو کسی " درخت " ہی کے ہوں گے ، اگر محض " ورق " کہا جاتا تو بھی اس سے " درخت ہی کا پتّہ " سمجھا جاتا ، خود قرآن نے محض " ورق " کہہ کر " درخت کا پتّہ " مراد لیا ہے :۔

يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِن وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا " اللہ بحر و بر کی تمام چیزوں سے واقف ہے اور کوئی پتّہ نہیں گرتا مگر وہ اس کو بھی جانتا ہے ۔ " (انعام ، ۷)

مگر اس جگہ نہ محض " ورق " کہا گیا اور نہ " ورقِ الشجرہ " بلکہ " ورقِ الجنّۃ " کہا گیا ۔ ظاہر ہے کہ یہاں پر " ورقِ الشجرۃ " اس لئے نہیں آیا کہ لفظ " شجرہ " کو قرآن نے اِس محل پر ایک مخصوص مفہوم اور مجازی معنی میں استعمال کیا تھا لہٰذا جب " قربتِ شجرہ " کے سلسلے میں واقعی " درخت کے پتّے " کے ذکر کا موقع آیا تو لفظ " ورقِ الجنّۃ " استعمال کیا تا کہ اس طور پر واضح ہو جائے کہ اِس سلسلے میں لفظ " الشَّجَرَۃَ " کا مفہوم کچھ اور ہے اور " جنّت " بھی محض " باغ " کو کہتے ہیں ۔

" میاں بیوی " کے ذکر ، " قُربت " کی ممانعت ، اور " ھٰذِہٖ " کے اشارۂ قریب سے صاف ظاہر ہے کہ " شجرہ " کے معنی یہاں " درخت " کے نہیں ہیں ، اور درحقیقت " قُربتِ شجرہ " کی ممانعت سے مُراد واقعی کسی " درخت " کے پاس جانا یا اُس کا " پھل " کھانا نہیں تھا بلکہ " شجرہ " سے مطلب " نسلی سلسلہ " اور " قُربتِ شجرہ " سے مراد " جنسی تعلّق " ہے اور " ستر کھُلنے " سے مطلب

یہ ہے کہ دونوں اب تک جو اپنے اس حصۂ جسم کی خاصیت واہمیت اور اس کے فعل واثر سے ناواقف تھے، وہ واقف ہو گئے، جب تک وہ اس سے باخبر نہ تھے اور "معاہدہ" پر عمل پیرا ہونے کے سبب انھوں نے "قربتِ شجرہ" نہ کیا تھا، وہ "تقویٰ شعار" تھے۔ گویا اُن کے جسم پر ایک لباس سا تھا مگر جب انھوں نے اللہ کے ساتھ کیئے ہوئے "عہد" کو "فراموش" کر کے "حوریۂ شیطانی" سے "قُربتِ شجرہ" کر لیا تو "لباس تقویٰ" اُتر گیا جس کے نتیجے میں اُن کے "ستر" ایک دوسرے پر کُھل گئے۔ اور جب وہ اپنے اِس حصۂ جسم کے فعل و خاصیت سے باخبر ہو گئے تو فطری طور پر "شرم و حیا" محسوس کرنے لگے، اور وہاں "کپڑا" تو تھا نہیں لہذا درخت کے پتوں سے ہی اپنے اپنے اس حصۂ جسم کو چُھپانے لگے، یکایک :-

نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا ۔ ان کے رب نے ان کو پکارا کہ کیا
عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ میں نے تمہیں شجرہ سے متعلق ممانعت
اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ نہ کر دی تھی؟ اور کیا یہ بھی بتا نہ دیا تھا کہ بلا شبہ
مُّبِيْنٌ ﴿ (اعراف ۲) شیطٰن تمہارا صریح دشمن ہے؟"

دیکھیے جس وقت "ممانعت" کی گئی تھی تو صرف "آدم" کو مخاطب کیا گیا تھا کیونکہ "اقدامِ فعل" کا اندیشہ "آدم" ہی کی طرف سے تھا، مگر اب جب کہ اُنھوں نے "قربتِ شجرہ" یعنی "جنسی تعلّق" پیدا کر لیا تھا اور اِس طور پر دونوں "میاں بیوی" مُرتکب ہو چکے تھے تو دونوں کو آواز دی گئی مگر جو کچھ اُن سے کہا گیا اُس میں بھی اُن کے اِس فعل کو "جرم" نہیں قرار دیا گیا۔

کیونکہ اوّل تو یہ فعل ہی محض وسوسۂ شیطانی سے بلاقصد وارادہ عمل میں آگیا تھا، دوسرے دونوں "میاں بیوی" ہی تھے پھر "تعلّق جنسی" بھلا "جُرم" کیسے قرار پاسکتا تھا۔ ؟ تیسرے "قربتِ شجرہ" کی ممانعت "بطور حُکم" نہیں بلکہ بربنائے "معاہدہ" تھی۔ چنانچہ قرآن نے اس فعل کے ازتکاب کو "زَلّہ" کے لفظ سے ظاہر کیا ہے :۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا ۔ سو شیطان نے بہکا کے، اُن کے

(بقرہ ، ۴) قدم کو ڈگمگا دیا "

"زَلّہ" کے معنی ہیں "بلا قصد وارادہ پاؤں کا ڈگمگا جانا" یعنی وہ لغزش جو بلاارادہ ہوجائے، مطلب یہ ہوا کہ "آدمؑ" اور ان کی "بیویؑ" نے یہ کچھ "اراداتاً" اور "قصداً" نہیں کیا تھا، بلکہ شیطان کے اشتعال پر، ان سے غیر ارادی طور پر یہ فعل سرزد ہوا۔ یہاں بھی سوچیے کہ "جنسی فعل" ہی غیرارادی طور پر انسان سے بعض اوقات سرزد ہوا کرتا ہے یا کسی "درخت کا پھل کھانا" بھی؟ اسی لیے تو جنسی معاملات میں ممنوع اوقات یا بعض مقامات پر، احترازِ کامل کا مشورہ دیا جاتا ہے کیونکہ "مبادیات" تحریک دلاکر عمل کرا ہی دیتے ہیں اور جنسی تعلّق کے سلسلے میں محاورہ عام ہے کہ :۔

"جو گدھا چراگاہ کے آس پاس پایا جائے وہ کسی دن چراگاہ میں ضرور داخل ہوجائے گا ـــ "

لہٰذا یہ قطعی ہے کہ "قُربتِ شجرہ" سے مُراد "جنسی تعلّق" تھا اور یہی وجہ ہے کہ "آدمؑ" کے اس فعل کو "جُرم" کہیں پر نہیں کہا گیا ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ " آدم " نے " نافرمانی " کی بھی اور پھر " توبہ " بھی کی تھی اور اللہ نے اُن کا قصور معاف بھی کر دیا تھا ۔ مگر قرآن سے اِن میں سے کسی ایک بات کی بھی تصدیق نہیں ہوتی ۔ یوں بھی بات صاف ہے کہ جب آدم نے " جرم " کیا تھا اور پھر " توبہ " بھی کر لی تھی اور ان کا " قصور معاف " بھی ہو گیا تھا تو وہ " جنّت " سے نکالے کیوں گئے ؟ ۔ اور جب جنّت سے وہ نکالے گئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو انھوں نے " توبہ " ہی نہیں کی یا اُن کا جرم معاف ہی نہ کیا گیا ۔ اگر یہ کہا جائے کہ " جنّت " سے نکل جانے کے بعد انھوں نے توبہ کی تھی تو یہ اور غلط ہو گا ۔ کیونکہ سورۃ اعراف کی آیات سے ظاہر ہے کہ " آدم " نے " رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنفُسَنَا " والی معذرت " جنّت " ہی میں کی تھی کیونکہ اس کے بعد بھی دوبارہ وہی حکم ہوا " قَالَ اهْبِطُوا " (ہم نے کہا کہ بس نکلو) لہذا انھوں نے یہ توبہ یا معذرت جو کچھ بھی کی تھی وہ " جنّت " سے نکلنے سے قبل ہی کی تھی مگر اس کے باوجود وہ نکالے گئے ۔ لہذا یہ قطعاً غلط ہے کہ " آدم " نے " توبہ " کی تھی اور " قصور معاف بھی ہو گیا تھا " یہ بات سرے سے لغو ہے ۔ کہ اللہ " توبہ " کرنے کے بعد بھی کسی کو معاف نہ کرے اور اس جرم کی اُس کو سزا دے ۔ لہذا اگر آدم کا گناہ معاف ہو گیا تھا تو وہ ہرگز " جنّت " سے نکالے نہیں جاتے ۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ " آدم " نے " نافرمانی " بھی ضرور کی اور " توبہ " بھی کی ، مگر ان کا قصور " معاف " نہ کیا گیا اور وہ " جنّت " سے نکال ہی دیئے گئے ، ان حضرات کی قرآنی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے جب قبطی کو مار ڈالا تھا

اور استغفار کی تھی کہ " فَاغۡفِرۡ لِیۡ " (قصص ۲) "سو میرا قصور معاف کر دے" تو فرمایا گیا کہ " فَغَفَرَ لَهٗ " " سو اس کا گناہ معاف کر دیا گیا " یا جب حضرت داؤدؑ نے مغفرت چاہی تھی تو فرمایا گیا تھا کہ " فَغَفَرۡنَا لَهٗ ذٰلِکَ " (ص ۲) " سو ہم نے اس کو وہ معاف کر دیا " مگر " آدمؑ " کے سلسلے میں، قرآن میں ایسا کوئی لفظ، کہیں پر بھی نہیں آیا ہے، جس سے ظاہر ہو کہ ان کا قصور معاف کر دیا گیا تھا ——— یہ خیال بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ ظالم انسان نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص جرم سرزد ہونے کے بعد بھی بہ ندامت توبہ و استغفار کرے اور معافی چاہے تو بھی اللہ اس کو معاف نہ کرے۔ اللہ کا تو صاف طور سے اور اصرار کے ساتھ وعدہ ہے کہ اگر غلطی سے کوئی شخص کوئی قصور کر بیٹھے اور وہ جلد ہی توبہ کر لے، تو ایسوں کی " توبہ " قبول کرنا ہم نے اپنے ذمے فرض کر لیا ہے :-

(۱) اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَی اللّٰهِ لِلَّذِیۡنَ " اللہ کے حضور توبہ کی قبولیت تو ان ہی یَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ لوگوں کیلئے ہے جو نادانی و بے خبری سے ثُمَّ یَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِیۡبٍ فَاُولٰٓئِکَ سے کوئی بُرائی کر بیٹھتے ہیں اور پھر جلدی ہی توبہ یَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَیۡهِمۡ (نساء ۳) کر لیتے ہیں سو ایسوں پر اللہ ضرور توجہ کرتا ہے "

(۲) وَالَّذِیۡنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ " اور جنھوں نے بُرے کام لئے پھر اسکے تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِهَا وَاٰمَنُوۡۤا بعد توبہ کر لیا اور یقین کیا، تو بیشک تیرا پروردگار اِنَّ رَبَّکَ مِنۡۢ بَعۡدِهَا لَغَفُوۡرٌ اس توبہ کے بعد، گناہ کا معاف کرنیوالا رَّحِیۡمٌ۔ (اعراف ۱۹) رحمت والا ہے ——"

(۳) وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ "اور جو کوئی بُرا کام کرے یا اپنے آپ پر
نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ظلم کرے، پھر اللہ سے مغفرت چاہے
يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۔ تو وہ اللہ کو، بخشنے والا، رحم کرنے
(نسآء ۱۶) والا پائے گا ۔"

(۴) اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ "ہاں مگر جو لوگ توبہ کریں اس کے
ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بعد اور اپنی اصلاح کریں تو بے شک
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (آل عمران ۹) اللہ بخش دینے والا مہربان ہے ۔"

(۵) اِنِّىْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ ۔ "بے شک میں اس کو معاف کر دینے والا
(طٰہٰ ۴) ہوں جو توبہ کرے ۔"

پھر جب آدم نے فوراً ہی توبہ کر لی تھی تو اللہ نے انھیں معاف کیوں نہ کیا ؟ ۔ اور ان کو " توبہ " کرنے کے بعد بھی جنّت سے نکال باہر کیوں کر دیا؟ دراصل نہ تو " آدم " کو کوئی " حکم " ہی دیا گیا تھا، جس کی انھوں نے " نافرمانی " اور " خلاف ورزی " کی تھی اور نہ " آدم " نے کوئی " جرم " ہی کیا تھا جس کی انھیں " معافی " مانگنی چاہیے تھی ۔ اور جب " آدم " نے کوئی " جرم " یا کسی " حکم " کی خلاف ورزی ہی نہیں کی تھی تو پھر معافی کس بات کی چاہتے ؟ ۔ " آدم " نے حقیقتاً اپنے کو " مجرم " اور " قصوروار " گردانا ہی نہیں اور " معافی " چاہی ہی نہیں ۔ اور جب " آدم " ہی نے " معافی " کی کوئی درخواست ہی نہیں کی، تو اللہ تعالےٰ نے معاف کیا اور کس کو کرتا ؟ ۔ دراصل یہ سب مفروضات ہیں ۔ نہ تو " قرآن میں کہیں پر یہ ہے کہ

" آدم " نے اللہ تعالےٰ سے اپنے قصور کی " معافی " چاہی ، اور نہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے قصور معاف کیا ۔ اور نہ ہی کہیں پر یہ ہے کہ چونکہ " آدم " نے اپنے جُرم کی معافی نہیں چاہی اس لیئے اللہ تعالےٰ نے ان کو کوئی سزا دی ۔

" قُربتِ شجرہ " کی ممانعت ، دراصل کوئی " حکم " نہیں تھا ۔ جس کی " آدم " سے " خلاف ورزی " ہوئی ہو اور جس کے لیئے " آدم " معافی چاہتے ۔

" قُربتِ شجرہ " کی ممانعت اور جنّت کا قیام دراصل ایک " معاہدہ " کی بناء پر تھا ۔ اللہ اور آدم کے درمیان ایک " عہد " تھا ۔ اور جب آدم نے " قُربتِ شجرہ " کر لیا تو یہ کسی حکم کی خلاف ورزی نہ تھی جس کی وہ " معافی " چاہتے ، البتہ خلاف معاہدگی ضرور تھی جس کے ذمّے دار " آدم " تھے ، اسی لیئے " آدم " کو " قرآن میں کہیں پر بھی مجرم " نہیں گردانا گیا ہے " قرآن " نے اس مسئلہ کو بہت صاف کر دیا ہے ، آنحضرت سے مخاطبت میں چند مسئلے سمجھاتے ہوئے ، اُن سے کہا گیا ہے کہ :-

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ " اور اس سے پہلے ہم نے آدم سے ایک
مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ عہد لیا تھا ، سو اس نے خلاف معاہدگی کی ۔
نَجِدْ لَهُ عَزْمًا (طٰہٰ ٦) اور ہم نے اس میں پختگی نہیں پائی ۔"

غور فرمایئے آدم کو کوئی " حکم " نہیں دیا گیا تھا ۔ بلکہ " آدم " سے صرف ایک " معاہدہ " ہوا تھا ۔ اسی لیئے یہاں " آدم " کا جو کچھ نقص (DEFECT) بتایا گیا ہے وہ یہی اور صرف یہی کہ اس کے ارادہ میں ہم نے پختگی نہیں پائی ۔ یعنی " آدم " عہد سے پھر گیا ۔ اُس نے اللہ سے کیئے ہوئے معاہدہ کو توڑ دیا ۔

پھر جب "آدم" نے اُس معاہدہ" ہی کو توڑ دیا جس کی بنا پر اُن کو "جنّت" میں قیام کا حق ملا تھا تو لازمی طور پر انھیں، وہ "جنّت" خالی کرنی پڑی، جس میں وہ تھے۔ یہ آیت واضح طور پر بتاتی ہے کہ "آدم" سے ایک "عہد" لیا گیا تھا۔ اور "عہد شکنی" کوئی جرم نہیں، جس کی سزا دی جائے۔ بلکہ معاہدہ شکن، اپنی عہد شکنی سے خود اپنے آپ نقصان اٹھاتا ہے۔ یہ کچھ آدم ہی کے لئے مخصوص نہیں

اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ .... اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخَاسِرُوْنَ

"اللہ سے کئے ہوئے معاہدہ کو، اس کے بعد جو لوگ توڑتے ہیں وہ خود ہی خسارہ میں پڑنے والے ہوتے ہیں" (بقرہ ۳۵)

غور فرمایئے پہلے یہ عام قانون "بیان ہوا ہے اور دو آیتوں کے بعد آدم کا متذکرہ قصہ شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا، جب تک آدم نے اس "عہد" کو توڑ نہ دیا، وہ معاہدہ شکنی کے مرتکب نہ ہوئے، تب تک وہ اس معاہدہ والی جنّت میں ٹھاٹھ سے رہے اور جب انھوں نے وعدہ بھلا دیا اور "معاہدہ" توڑ دیا تو آدم کو وہ جنّت" بھی خالی کر دینی پڑی جو اس وعدہ پر ملی ہوئی تھی۔ مگر "معاہدہ" کوئی "حکم" نہیں ہے، جس کی خلاف ورزی "جرم" ہو۔ "معاہدہ شکنی" سے صرف یہی ہوتا ہے کہ اُس "معاہدہ" کی بنا پر جو حقوق و مراعات ملے ہوتے ہیں، وہ ساقط و زائل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ "آدم" نے بھی جب اس" معاہدہ" کو توڑ دیا تو "جنّت" کے قیام سے بھی وہ دست بردار ہو گئے، اُنھوں نے جو کچھ دعاء کی ہے اُس میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ قیامِ جنّت کے خواہاں ہیں

یا مزید قیام کی خواہش رکھتے ہیں۔ اُن کو کہا گیا تھا کہ " فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ "
(تم اپنا آپ نقصان کر لینے والوں میں سے ہو جاؤ گے) اور آدمؔ نے اعتراف
کر لیا کہ ہاں " ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا " (ہم نے واقعی اپنا نقصان آپ کر لیا) " معاہدہ شکنی "
کوئی " جرم " تو ہے نہیں کہ جس کی معافی چاہی جائے ، چنانچہ " آدمؔ " نے
بھی معافی چاہنے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کی ۔ اور اس لئے انھوں
نے معافی کی کوئی درخواست ہی نہیں کی ۔ ان کی دعاء میں کوئی جملہ ایسا نہیں
ہے کہ " اے اللہ تو میرا گناہ معاف کر دے " ہاں آدمؔ کو یہ احساس ضرور تھا
کہ " معاہدہ شکنی " ہوئی ہے ، وہ وعدہ خلافی کے مُرتکب ہوئے ہیں ۔ ایفائ
عہد ایک زبردست اخلاقی پابندی ہے :۔

اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ " اور جب تم لوگ اللہ سے کوئی عہد
کر دتو اس کو نباہو ضرور " (نحل ۱۳)

اسی لئے انھوں نے " مزید خسارہ " سے بچنے کے لئے اللہ تعالےٰ کی صفتِ
رحم وکرم سے اپیل ضرور کی وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ بہر کیف!
آیتِ زیرِ تذکرہ سے صاف ظاہر ہے کہ " آدمؔ " نے کوئی " جُرم " اور
" نافرمانی " نہیں کی تھی بلکہ ان سے جو " معاہدہ " ہوا تھا ، اس کی آدمؔ نے
خلاف ورزی کی تھی ، اور پھر اس کا نتیجہ بھی بُھگتا ۔ اسی مفہوم کو دوسری
جگہ ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ " وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى " (طٰہٰ ۷)
اِس آیت کا ترجمہ عام طور سے یہ کیا گیا ہے کہ :۔

" اور آدم نے اپنے رب کا گناہ کیا ، سو وہ گمراہ ہو گیا "

مگر یہ ترجمہ محتاج نظر ثانی ہے "عَصٰی" کے معنی محض "بات نہ ماننے" کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ بات کہ "قربتِ شجرہ" نہ کرنا، آدمؑ سے نہیں مانی اس لیئے "عصیٰ" کہا گیا۔ فرعونؔ نے موسیٰؑ کی بات نہ مانی تو کہا گیا :۔

فَکَذَّبَ وَعَصٰی (نزعت ۱) "سو اُس نے جھٹلایا اور کہنا نہ مانا"

حضرت موسیٰؑ جب "بندۂ عالِم" (جن کو خضرؑ کہا جاتا ہے) سے ملے اور کچھ سیکھنا چاہا تو "بندۂ عالِم" نے کہا :۔

لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا (کہف ۹) "میرے ساتھ رہ کر تم صبر نہ کر سکو گے"

حضرت موسیٰؑ نے بر بنائے "حاکمیت و محکومیت" نہیں بلکہ بہ سبیل "عہد و پیمان" جواب دیا کہ :۔

لَآ اَعْصِیْ لَکَ اَمْرًا (کہف ۹) "میں کسی معاملہ میں ایسا نہ کرونگا کہ آپ کی بات نہ مانوں"

آنحضرتؐ سے فرمایا گیا :۔

قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ "کہدو، کہ میں اپنے پروردگار کی بات نہ مانوں تو مجھے اس بڑے عذاب کے دن کا خوف ہے" (انعام ۲)

اس سے پہلے کی آیت میں ہے کہ مجھ سے کہا گیا ہے کہ "اَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ" یعنی "میں سب سے پہلے بات ماننے والا بنوں" دراصل "اسلام" بھی ایک "معاہدہ" ہی ہے، جب ہی تو مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ :۔

اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ "اگر تم نے میرے ساتھ کیے ہوئے عہد کو پورا کیا تو میں بھی تمہارے ساتھ کیے ہوئے عہد کو پورا کرونگا" (بقرہ ۵)

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ "عَصٰی" کے معنی "بات نہ ماننے" کے ہیں۔ آدمؑ نے عہد شکنی کو تو "عَصٰی" کہا گیا۔ لہذا "عَصٰی" کا ترجمہ زیر بحث آیت میں "گناہ" نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح "غَوٰی" کے معنی "اپنی جگہ سے اُکھڑ جانے" کے ہیں، لہذا اس آیت کا ترجمہ یوں ہوگا:۔

"اور آدمؑ نے اپنے رَبّ کی بات نہ مانی، سو وہ اپنی جگہ سے اُکھڑ گیا"

"عہد" کی وجہ سے لفظ "عَصٰی" اور "شجرہ" کی رعایت سے "غَوٰی" استعمال کیا گیا ہے۔ اور ہر "معاہدہ" دونوں فریق کی رضامندی ہی سے ہوتا ہے۔ اور اس پر عمل درآمد ہوتا ہے:۔

اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ "تم میرے عہد کو پورا کرو تو میں تمہارے

(بقرہ ۵) عہد کو پورا کروں گا۔"

آدمؑ نے "معاہدہ" کیا، چنانچہ "معاہدہ" کے مطابق رہنے کو جنّت ملی اور مفت کا کھانا۔ پھر "عہد" کو انھوں نے توڑ دیا، اور چونکہ اس عہد شکنی کے نتیجے میں معاہدہ والی "جنّت" چھوڑ دینی پڑی، اس لئے اس کو اپنی جگہ سے اُکھڑ جانا کہا گیا۔ مگر "معاہدہ شکنی" کوئی جُرم نہیں اس لئے نہ تو اس کو "جُرم" سے نام زد کیا۔ نہ یہ "حُکم" تھا کہ جس کی "خلاف ورزی" ہوئی اور اس کی اُن کو سزا دی جاتی یہی وجہ ہے کہ "قربتِ شجرہ" کے بعد اُن سے بجز اس کے اور کچھ نہ کہا گیا کہ "کیا ہم نے تم کو پہلے ہی یہ نہ کہہ دیا تھا کہ ذرا شیطان سے ہوشیار رہنا، اور کیا تم کو "قربتِ شجرہ" سے روکا نہ گیا تھا؟ آدمؑ نے بھی جواب میں نہ تو اقرارِ جرم ہی کیا، نہ قیامِ جنّت پر اصرار کیا اور نہ معافی ہی کی کوئی درخواست کی "معاہدہ شکنی"

کا اعتراف البتہ کر لیا، چنانچہ اس عہد شکنی کے سبب ان کو "جنّت" خالی کر دینے کا حکم دیا گیا۔ "ہبوط" کوئی "سزا" نہیں ہے، جس سے "جرم" ثابت ہو۔ "زہر" کھا کے کوئی مر جاتے تو کیا اس کے "مرنے" کو "سزا" سے تعبیر کیا جائے گا؟۔ یا وہ "زہر خوری" کا لازمی نتیجہ کہا جائے گا۔؟ لہٰذا یہ بالکل غلط ہے کہ "آدم" کے "جرم" اور "معافی" اور "سزا" پر بحث کی جائے۔ ان چیزوں کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے، "آدم" نے "معاہدہ" توڑ دیا، اس لئے "جنّت" کو چھوڑ دینے کا حکم ہوا۔ بس اس سے بھی ظاہر ہے کہ "قربتِ شجرہ" کا مطلب واقعی کسی "درخت کا پھل" کھانا نہیں بلکہ اس سے مراد "جنسی تعلّق" تھا جس کا اثر ان کی زندگی پر پڑنا تھا، اسی وجہ سے محض سوال پر اکتفا کیا گیا کیونکہ اب وہ اس "قربتِ شجرہ" کے سبب "رحمت" کی زندگی سے نکل کر "زحمت" کی زندگی میں خود چلے آئے تھے، سوال کا بھی مقصد صرف یہ تھا کہ "آدم" اور ان کی "بیوی" اس "جنسی ملاپ" کے سبب جب اس تکلیف کی زندگی میں داخل ہوں، تو یہ نہ سمجھیں اور کہیں کہ ان پر اللہ نے ظلم کیا۔ بلکہ یہ سمجھ اور جان لیں کہ انھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ اور اپنے ہاتھوں خود مصیبت مول لی ہے۔ کیا آج بھی یہی نہیں ہوتا؟ ایک "مرد" اور ایک "عورت" کی شادی سے پہلے کی زندگی، اپنے باپ ماں کے گھر میں "جنّت" کی زندگی ہوتی ہے، کوئی غم نہیں، کوئی فکر نہیں، کوئی جھنجھٹ نہیں، مگر جب وہ اپنے آپ پر ظلم کرتے اور رشتہ مناکحت میں جُڑ جاتے ہیں تو پھر دیکھ لیجئے کہ "توالد و تناسُل" کا سلسلہ قائم ہو جانے

سے وہ کن کن پریشانیوں اور جھنجھٹوں میں نہ گرفتار ہو جاتے ہیں ؟ پھر جو لوگ " ازدواجی زندگی " میں پھنس کر پریشان ہوتے ہیں کیا وہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن پر اللہ نے ظلم کیا ؟ یا وہ خود اپنے ہاتھوں یہ مصیبت مول لے لیتے ہیں؟ بہرکیف ! اب جب کہ " آدم " اور ان کی " بیوی " دونوں " قربتِ شجرہ " کے بعد اس کا " مزہ " چکھ چکے تھے تو یہ ناممکن تھا کہ وہ آئندہ اس سے محترز نہ رہیں ۔ اور اب سلسلۂ توالد و تناسل قائم ہو جانا لازمی تھا، جس وجہ سے وہ اب اُس پہلی بلند سطحِ زندگی پر نہیں رہ سکتے تھے ، لہٰذا :۔

قُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۔

" ہمنے کہدیا کہ نکل جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اب تمہارے لئے زمین میں ایک مدت معین تک کے لئے ٹھکانا اور گذارے کا سامان ہے ۔" (بقرہ ۴)

یہی وہ ایک گونہ دشمنی و عداوت ہے جو آج " مرد " اور " عورت " کی جنس میں پائی جاتی ہے ۔ بہرکیف ! اس حکم پر " آدم " کی " بیوی " نے تو ایک لفظ بھی مُنہ سے نکالنے کو سوچا بھی نہیں ، کیونکہ اوّل تو معاملہ واقعی کسی "درخت" کا " پھل " کھانے کا نہ تھا کہ کچھ وہ بھی جھوٹ سچ عذر کرتیں بلکہ معاملہ " جنسی تعلق " کا تھا اور فطری شرم و حیا مانع تھی کہ اس معاملے میں وہ زبان کھولتیں ۔ دُوسرے " عورت " جنسی غلطی پر کبھی پچھتاتی نہیں ہے ، اسی لئے وہ اگر کبھی ایسی غلطی کر بھی بیٹھتی ہے ، تو بھی آخر وقت تک اُس کو نباہ دیتی ہے ، تیسرے اقدام " آدم " کی طرف سے ہوا تھا اس لئے اس کی ذمہ داری بھی " آدم " کے سر جاتی تھی۔

چنانچہ "آدم" ہی کی طرف اس کو منسوب بھی کیا گیا :۔

(۱) وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ ۔ "اور آدم نے اپنے رب کی بات نہ مانی سو وہ اپنی جگہ سے اکھڑ گیا ۔" (طٰہٰ ۷)

(۲) وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا ۔ "اور اس سے قبل ہم آدم سے ایک عہد لے چکے تھے سو اس نے خلاف معاہدگی کی۔ اور ہم نے اس میں پختگی نہ پائی[ا] ۔" (طٰہٰ ۷)

البتہ "آدم" نے اقدام کیا تھا اس لئے انھوں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ "عہد شکنی" ضرور ہوئی ہے لہذا کچھ اس موقع پر کہنا چاہیے ۔ مگر کیا کہنا چاہیے ؟ مشیّت نے پھر رہنمائی کی :۔

فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ "سو سیکھ لئے آدم نے اپنے پروردگار سے چند کلمے ۔" (بقرہ ۴)

کون سے کلمے "سیکھ لئے ؟ یہ "جواب" نہیں کہ :۔ ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ !
بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش ؟

بلکہ یہ معذرت " کے کلمے ۔ اور اس میں ان کی "بیوی" نے بھی ہاں میں ہاں ملائی :۔

ا؎ یہ آیت سورۂ طٰہٰ میں "آدم" کا قصہ شروع کرنے سے پہلے آئی ہے ، اس آیت کے بعد "آدم" کا قصہ شروع کیا گیا ہے ، چونکہ خطاب آنحضرت سے تھا اس لئے اس ٹکڑے میں "مِن قَبْلُ" آیا ہے ، یعنی تم سے پہلے ایسا ہوا ہے ۔"

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (اعراف ۲)

"دونوں کہنے لگے کہ اے میرے رب! ہم دونوں نے اپنے آپ پر ظلم کر لیا اور اگر اب آپ ہماری مغفرت نہ کرینگے اور ہم پر رحم نہ کھائیں گے تب ہم اور بھی خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔"

یوں کہنے کو تو "معذرت" تو "آدم" اور ان کی "بیوی" دونوں ہی نے کی مگر ذرا غور کیجیے، اُنھوں نے یہ نہیں کہا کہ اب ہم سے آئندہ ایسی غلطی اور یہ حرکت نہ ہوگی اور ہم پھر اس فعل کے ارتکاب کا اعادہ نہ کریں گے۔ اُنھوں نے یہ اعتراف کیا ہی نہیں کہ ہم سے کوئی "غلطی" بھی ہوئی ہے۔ یہانتک کہ یہ بھی نہ کہا کہ ہمارے گناہ کو "معاف کر دے"[1] بلکہ کہا صرف یہ کہ "اگر تو نے معاف نہ کیا اور رحم نہ کھایا تو ہمارا شمار نقصان اٹھانے والوں میں ہو جائیگا"۔ پھر ذرا غور کیجیے "رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا" انھوں نے نہیں کہا تاکہ "اقرارِ جرم" اور "درخواستِ معافی" متصور ہو بلکہ "اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا" کہا، یعنی "اگر تو نے معاف نہ کیا تو"۔ بھلا اگر یہ "جُرم" ہوتا یا یہ کسی "درخت" کا پھل کھانے کا معاملہ ہوتا تو دونوں اس "جرم" کی معافی چاہتے۔ اس بات کی ضمانت دیتے اور اس کا عہد کرتے کہ آئندہ پھر ہم سے ایسی غلطی اور ایسی حرکت کبھی نہ ہوگی۔ اور واقعی دونوں باز بھی آجاتے، مگر یہ تو "جنسی تعلق" کا معاملہ تھا اور وہ اس کی لذت سے آشنا ہو چکے تھے، لہذا اس سے تائب ہونے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اُنھوں نے اقرارِ جُرم تو نہیں کیا، کیونکہ واقعی اُنھوں نے کوئی "گناہ"

---

[1] بر خلاف اس کے، موسیٰ کی دعا ملاحظہ ہو:— رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ "اے میرے پروردگار! میں نے، اپنے آپ پر ظلم کر لیا سو میرا گناہ معاف کر دے۔" (قصص ۲)

نہیں کیا تھا۔ کوئی "ناجائز" حرکت نہ کی تھی، البتہ انھوں نے یہ ضرور تسلیم
کرلیا کہ ہاں بیشک ہم نے "معاہدہ شکنی" کرکے اپنے ہاتھوں اپنے آپ پر ظلم
کرلیا ہے (ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا) ظاہر ہے کہ اب "آدم" اور ان کی "بیوی"
کی "قبل از قربتِ شجرہ" والی پُرامن اور پُرسکون زندگی کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ وہ
اُس بلند معیارِ زندگی کو کھوچکے تھے جس میں بے محنت و مشقّت وہ ٹھاٹھ سے
کھاپی رہے تھے۔ وہ اس جنّت کو چھوڑنے اور خالی کرنے پر مجبور تھے، جو
محض اسی "معاہدہ" پر اُن کو ملی ہوئی تھی۔ وہ "قربتِ شجرہ" کے بعد اس
کے "ذائقہ" سے باخبر و لذّت آشنا ہوچکے تھے۔ جس کا نتیجہ "سلسلۂ توالد
وتناسل" کا قائم ہوجانا تھا۔ لہٰذا اب اُن کی وہ جنّت والی زندگی تو باقی
رہ ہی نہیں سکتی تھی یا رکھی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ کوئی "زہر" کھاکے یہ
چاہے کہ اس کا اثر، اُس کی ذات پر مترتّب نہ ہو، تو یہ ممکن ہی نہیں ہے، یہ
تو خدائی قانون ہے اور اٹل ہے کہ ہر فعل کا اثر، فاعل کی ذات پر مترتّب ہوگا:۔

(۱) مَنْ یَّکْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا "جو شخص ارتکابِ اِثم کرتا ہے وہ اپنی
یَکْسِبُهٗ عَلٰی نَفْسِهٖ (نساء ۱۶) ذات پر، اس کا اثر پہونچاتا ہے۔"

(۲) وَلَا تَکْسِبُ کُلُّ نَفْسٍ اِلَّا "اور جو شخص بھی، جیسا کچھ کرتا ہے،
عَلَیْهَا۔ (انعام ۲۰) اس کا اثر اُسی پر رہتا ہے۔"

ایک شخص "بیوی" بھی "بیاہ لاتے" "جنسی تعلّق" بھی قائم کرلے، اور
اس کے بعد بھی متوقع ہو کہ شادی سے پہلے والا، آرام و سکون اُس کو ملے؟ اُس
کو وہ بے فکری واطمینان حاصل ہو جو شادی سے پہلے تھا؟ تو یہ ناممکن ہے۔ لہٰذا "آدم"

کو بھی وہ ” جنت “ تو دوبارہ ل نہیں سکتی تھی۔

موجودہ دور سے پہلے روس میں شادی کی یہ ایک عام رسم تھی کہ

کا ایک گجرا دولہا دلہن کے سر پر باندھا جاتا تھا جس کا مقصد ان دونوں پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ اب تمہیں تلخی زندگی کا مزہ چکھنا پڑیگا ازدواجی تعلق قائم کرنا جنت کی زندگی سے نکلنا ہے۔ بہر کیف! آدم کی دعا ملاحظہ ہو۔

” اقرارِ جرم “ نہیں ” طلبِ مغفرت “ نہیں۔ آئندہ کے لئے ” توبہ “ نہیں، البتہ یہ ” انفعال “ ضرور تھا کہ ” ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا “ یہ ” اعتراف “ بیشک تھا کہ ” اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ “ اور یہ ” اعتماد “ یقینی تھا کہ ” اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ “ اور یہی اتنا کافی تھا، دریائے رحمت کو متلاطم کر دینے کے لئے۔ چنانچہ :۔

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ۝ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ (طٰہٰ ۷)

” پھر اسکے رب نے اُس کو نوازا اور اسکی طرف توجہ کی اور اس کی رہنمائی کی، کہا کہ نکلو دونوں یہاں سے اکٹھے، اور رہو ایک دوسرے کے دشمن، پھر اگر میری جانب سے تمہارے پاس کوئی ہدایت پہونچے تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کریگا وہ تو نہ گمراہ ہوگا اور نہ وہ مشقت ہی میں پڑیگا مگر ہاں جو کوئی میرے ذکر سے منہ موڑیگا تو اس کی معیشت تنگ کر دیجائیگی اور اسے میں قیامت کے دن بھی اندھا اٹھاؤں گا۔ “

"توبہ" کے معنی رجوع کرنے اور توجہ فرمانے کے ہیں۔ "آدم" اور ان کی بیوی" نے "قربتِ شجرہ" کر کے جو مصیبت خرید لی تھی وہ تو اب کسی قیمت پر لوٹائی نہیں جاسکتی تھی۔ زندگی کی اُس بلند منزل میں تو اب وہ رہ نہیں سکتے تھے، جہاں بے بیوی بچے والے رہتے ہیں۔ اُن کو تو نیچے گرنا، لازمی ہی تھا۔ لہذا اب انھیں نہ تو وہ زندگی دوبارہ بخشی جاسکتی تھی اور نہ خود "آدم" ہی نے اس کی قطعاً" پرواکر کے، اس کی خواہش ظاہر کی تھی۔ البتہ "آدم" نے "معاہدہ شکنی" کے احساس کی طرف اشارہ ضرور کیا تھا۔ اور اسی بناء پر، آئندہ مزید خسارہ سے بچنے کے لئے اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحم وکرم کو اپیل کیا تھا۔ لہذا اللہ تعالیٰ کیطرف سے بھی، محض عہد شکنی کو جتا کے، انھیں چھوڑ دیا گیا۔ نہ کوئی تنبیہ کی گئی، نہ سزا دی گئی اور نہ ہی "عہد شکنی" کے اعتراف ہی پر کچھ کہا گیا۔ کیونکہ اس "عہد شکنی" کی لازمی سزا خود "جنت چھوڑنا" تھی۔ البتہ "آدم" نے ندامت کیساتھ ساتھ، مزید نقصان سے بچنے کے لئے شانِ رحمت سے جو اپیل کی تھی اسکی بناء پر ان کی طرف توجہ کی گئی۔ (فَتَابَ عَلَیْہِ) اور بتا دیا گیا کہ، خیر! اب اس وقت تو، پھر لوٹ کر، پہلی "بلند زندگی" (جنّۃ) میں تمہارا آنا، ممکن ہی نہیں ہے، لہذا دونوں اُس "پست زندگی" میں جاؤ جو "قربتِ شجرہ" کا لازمی نتیجہ ہے۔ (اِھْبِطَا) البتہ مزید نقصان اٹھانے سے بچنے اور "خٰسِرِیْنَ" میں سے نہ ہو جانے کی ایک صورت تم کو یہ بتا دی جاتی ہے (وَھُدیٰ) کہ ہلاکت وبربادی سے محفوظ ومصؤن رہنے کی، بس اب صرف یہی ایک صورت ہے کہ آئندہ سے قوانین الٰہیۃ کے تابع زندگی بسر کی جائے، اور اگر ان قوانین الٰہیۃ کی تکذیب و

انکار کی روش اختیار کی گئی تو زندگی تو اُس پر تلخ ہو ہی جاتے گی مگر میری نصیحتوں
کی طرف سے آنکھ بند کر لینے کے جرم میں قیامت کے دن بھی وہ اندھا ہی بنا کے
اٹھایا جائے گا ـــــ یہ بھی لمبی سرگذشت، جس کا خلاصہ یہ ہے :۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ ۔ اور یہ واقعہ ہو کہ ہمنے انسان کو بہترین بہت
اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ میں پیدا کیا تھا، پھر اسکو پست ترین درجے
اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ۔ اِلَّا میں پھینک دیا، مگر ہاں وہ لوگ جو ایمان
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لائیں گے اور انکے اعمال صالح بھی ہونگے
فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ تو ان کے لئے ایسی مسلسل مزدوری
(والتین ۱) ہے جو کبھی منقطع نہ ہو گی ۔"

چنانچہ اسی رہنمائی کے لئے قوانین لے کر، اُس وقت تک "پیغمبر" آتے رہے
جب تک "انسانیت" نے مکمل نشوونما حاصل نہ کی تھی ۔ جب "انسانیت"
بڑھ کر سنِ شعور کو پہونچ گئی اور انگلی پکڑ کر اُس کو چلانے والے کی ضرورت نہ رہی
تو محمد رسول اللہ آئے اور آخری اور غیر فانی دستورِ حیات "قرآن" کی صورت
میں آئندہ ہمیشہ کے لئے رہنما، دے کر چلے گئے ۔

"آدم" جہاں مقیم تھے اُس کو "جنّت" کہا گیا ہے، "جنّت" کے معنی
صرف "باغ" کے ہیں، چاہے وہ آسمان پر ہو یا زمین پر، اگر کوئی "جنّت"
آسمان پر ہے تو ہو گی ۔ اور ہونا بھی چاہیئے، کیونکہ قرآن بھی ذاکر ہے اور عقل بھی
اس کو بخوبی تسلیم کرتی ہے، مگر "آدم" ہرگز اُس "جنّت" میں نہ تھے ۔

جو آسمان پر ہے، اور نہ ہرگز وہ آسمان سے زمین پر گرائے گئے۔ "آدم" جہاں پہلے تھے اول تو وہ "آسمانی جنّت" ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ "آسمانی جنّت" کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہاں جنّتی لوگ تپش اور سردی پائیں گے ہی نہیں۔ یعنی تپش اور ٹھنڈک کا وہاں سرے سے وجود ہی نہ ہوگا:۔

لَا یَرَوْنَ فِیْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِیْرًا "وہ وہاں تپش اور جاڑا کو پائیں گے ہی نہیں۔" (دھرا)

مگر "آدم" جس "جنّت" میں تھے اس کے بارے میں کہا گیا:۔

اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی "یہاں تم کو نہ پیاس لگے گی اور نہ تم دھوپ میں جلو گے" (طٰہٰ ۷)

غور فرمایئے نہ صرف یہ کہ دونوں کے الفاظ بدلے ہوئے ہیں بلکہ یہ بھی فرق ہے کہ آسمانی جنّت میں "تپش" کا سرے سے وجود ہی نہ ہوگا، جنّتی "دھوپ کی تپش" کو پائیں گے ہی نہیں۔ مگر آدم والی جنّت کے بارے میں کہا گیا کہ تم دھوپ میں نہ تپو گے، یعنی دھوپ کو تم پاؤ گے تو ضرور مگر اس باغ میں تم کو دھوپ تپائے گی نہیں۔ لہٰذا یہ قطعی ہے کہ "آدم" "آسمان والی جنّت" میں ہرگز نہ تھے۔ اگر یہ دونوں "جنّتیں" ایک ہی ہوتیں تو الفاظ انداز دونوں کا فرق نہ کر دیا جاتا۔ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ "جنّت" اور "لباس" لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ "جنّتیوں" کے بارے میں ہے کہ:۔

جَنَّةً وَّحَرِیْرًا (دھرا) "ان کو جنّت اور ریشمی لباس دیا جائے گا۔"

مطلب اس کا یہ ہے کہ "آسمانی جنّت" میں جو لوگ رہیں گے وہ "کپڑے"

ضرور پہنیں گے، وہاں " لباس " بھی لازمی ہوگا :۔

(۱) اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِىْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ " بیشک متقی پُرامن جگہ میں رہیں گے جنت
فِىْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ يَّلْبَسُوْنَ میں نہروں کے پاس اور وہ لباس بھی
مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ پہنیں گے ہلکا پُھلکا بھی اور دبیز بھی
(دخان ۳) ریشم کا ۔۔۔"

(۲) وَيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ " اور وہ لوگ سبز رنگ کے، ریشم کے
سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ (کہف ۴) باریک و دبیز کپڑے پہنیں گے ۔۔"

(۳) عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ " ان کے جسموں پر باریک ریشم کے
وَّاِسْتَبْرَقٌ (دھر ۱) سبز کپڑے ہوں گے ۔۔"

لہذا آسمانی جنّت میں رہنے والے، کپڑے ضرور پہنیں گے، ننگے نہ رہیں گے ۔ مگر " آدم " جس جنّت میں تھے اس کے بارے میں صاف کہا گیا تھا کہ :۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى " یہاں تیرے لئے گرسنگی و برہنگی
(طٰہٰ ۷) کا وجود بے معنی ہوگا ۔۔۔"

غور فرمائیے، نہ صرف الفاظ مختلف ہیں بلکہ اندازِ بیان بھی قطعاً جدا ہے، لہذا " آدم " زندگی میں ہرگز اُس آسمانی جنّت میں مقیم نہیں تھے جو مرنے کے بعد لوگوں کو ملے گی ۔ میسر ہے وہ " آسمانی جنّت " محض " اعمالِ صالحہ " نتیجے میں متقیوں کو ملنے کو ہے :۔

(۱) تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِىْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا " یہ وہ جنّت ہے جسکے تم مالک بنائے گئے ہو،
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (زخرف ۵) اپنے ان اعمال کے بدلے میں جو تم نے کیا تھا "

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُوْرِثُ مِنْ "یہ وہ جنت ہے جس کا وارث ہم اپنے اُن بندوں
عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا" (مریم ۴) کو بنائیں گے جو تقویٰ شعار ہوں گے"
بھلا "آدم" نے تخلیق کے بعد کون سے "اعمال" کئے تھے کہ وہ اس "عملی جنت"
میں مقیم ہو گئے تھے؟ چوتھے[4] اس "آسمانی جنت" کے بارے میں آیا
ہے کہ وہاں سے لوگ نکالے نہ جائیں گے:۔

(۱) جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِي وَعَدَ الرَّحْمٰنُ "وہ ہمیشہ کی جنتیں ہیں جن کا رحمٰن
عِبَادَهٗ نے اپنے مومن بندوں سے وعدہ کیا ہے" (مریم ۴)

(۲) وَاَنْتُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ۔ "اور تم اے جنتیو! یہاں ہمیشہ ہمیشہ
رہو گے۔" (زخرف ۷)

(۳) لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَّمَا "وہاں انکو کوئی تکلیف نہ پہنچے گی اور وہ
هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ (حجر ۴) وہاں سے نکالے بھی نہ جائیں گے۔"

پھر اگر "آدم" اُسی "آسمانی جنت" میں تھے تو وہ نکال باہر کس طرح کر دیئے گئے؟ قرآن میں کسی جگہ نہیں ہے کہ "آسمانی جنت" میں کوئی "مجرم" بھی رہے گا، یا کوئی جرم وہاں سرزد ہو گا، یا کسی جرم کی پاداش میں کوئی جنتی وہاں سے کبھی نکال بھی دیا جائے گا، پانچویں[5] جو "آسمانی جنت" ہے، وہ یقیناً "آسمان" پر ہے، پھر وہاں شیطان کا کہاں گذر؟ شیطان آسمانوں تک تو، کبھی کسی طرح پہونچ ہی نہیں سکتا چہ جائیکہ وہ آسمان پر کی جنت میں بھی گھس پڑے، شیطان وہاں کی کوئی بات تک تو سُن سکتا ہی نہیں چہ جائیکہ وہاں کے مقیم لوگوں کو اپنی وسوسہ اندازی کا آلہ کار بنا لے:۔

(۱) اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ .... وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۚ لَا يَسَّمَّعُوْنَ (والصّٰفّٰت ۱)

" ہم ہی نے زینت بخشی ہے آسمانوں کو.... اور ہر ملعون شیطٰن سے اس کو محفوظ کر دیا ہے وہ وہاں کی کوئی بات نہیں سن سکتے "۔

(۲) لَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ۞ (حجر ۲)

" بلاشبہ ہم نے آسمان میں بروج بنائے ہیں اور اسے دیکھنے والوں کے لئے خوشنما بنا دیا ہے اور ہر بھٹکے ہوئے شیطان سے اُسکی حفاظت کر دی ہے اور اگر کوئی سُن گُن لینا بھی چاہتا ہے تو پھر ایک واضح شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے "۔

پھر شیطان کس طرح اُس " جنت " میں پہونچ گیا اور اُس نے " آدم " کو بہکایا؟

کہا جاتا ہے کہ " ابلیس " جنات کا یہ سردار یا نمائندہ آسمان پر بلا لیا گیا تھا۔ اور وہ وہاں " معلم الملکوت " تھا۔ یعنی فرشتوں کو علم سکھاتا تھا، چنانچہ جس وقت فرشتوں کو سجدہ کا حکم ہوا، شاگردوں کے جھرمٹ میں یہ استاد بھی تھا۔ انکارِ سجدہ کے بعد بھی وہ زمین پر واپس نہیں بھیجا گیا، بلکہ وہیں مقیم رہا۔ اس لیے آدم کو بہکانے کا اُس کو موقع مل گیا۔

یہ پوری خیالی عمارت محض اِس بنیاد پر قائم کی گئی ہے کہ " جنات " کا یہ سردار یا نمائندہ ابلیس " معلم الملکوت " تھا۔ مگر یہ بنیاد قرآن کے سامنے ایک لمحہ نہیں ٹھہرتی۔ اگر یہاں پر " ملائکہ " کے معنی واقعی " فرشتے " کے ہیں جیسا کہ سمجھا گیا اور سمجھایا جاتا ہے تو وہیں پر اور اسی قصہ میں خود " ملائکہ " کا یہ قول موجود ہے کہ:۔

لَاعِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (بقرہ ۴۵) " ہم کو تو کچھ علم نہیں مگر اُتنا ہی بھر جتنا بھر کہ تُو نے ہم کو علم دیا ہے "

یعنی "ملائکہ" خدا کے سوا کسی دوسرے سے کوئی علم حاصل کرنے یا پانے کا قطعی انکار کرتے ہیں۔ لہذا جب جنّات کے سردار یا ابلیس کے معلّم الملکوت ہونے ہی کی بنیاد غلط ہو جاتی ہے تو اُس کے آسمان پر جلنے، رہنے اور آدم کے بہکانے کا سارا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور لامحالہ بات یہی ٹھہرتی ہے کہ قصہ آدم کا تعلق آسمان سے نہیں زمین سے ہے۔ مٹی جس سے آدم بنے، ابلیس جس نے آدم کو بہکایا اور جنّت جس میں آدم تھے، سب زمین کی چیزیں ہیں اور یہ سب قصہ زمین ہی کا ہے۔ اور قطعی ہونا چاہیئے کیونکہ آدم "خلیفۂ ارض" بنائے گئے تھے "خلیفۂ سماء" نہیں۔ لہذا "آدم" ہرگز "آسمان" پر نہیں بنائے گئے جب وہ "مٹی" سے بنے تو "مٹی" آسمان پر نہیں بلکہ "زمین" پر تھی، لہذا وہ یہیں "زمین" پر بنے۔ اور "زمین" پر ہی "باغ" میں رہے، قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے ظاہر ہو کہ "آدم" کو آسمان پر بنایا اور آسمان پر کی جنّت میں رکھا گیا تھا۔ یا وہ "زمین" پر گرائے گئے تھے "اِهْبِطُوْا" کے لفظ سے یہ سمجھنا کہ "آدم" آسمان سے زمین پر گرائے گئے، محض سادہ لوحی ہے، بنی اسرائیل سے بھی وادی سینا میں کہا گیا تھا کہ:۔

اِهْبِطُوْا مِصْرًا (بقرہ ۷) " نکل جاؤ شہر کی طرف "

پھر کیا اس کے معنی آسمان سے گر کر "شہر" کی طرف جانا ہے؟ "اِهْبِطُوْا" کا مطلب ہے کہ جہاں ہو یا جس زندگی میں ہو اُس سے نکلو، لہذا "آدم" نہ آسمان پر تھے اور نہ زمین پر گرائے گئے۔

"آدم" زمین ہی پر تھے اور "جنّت" کی زندگی سے مراد صرف وہ عرصۂ زندگی ہے جب وہ "عورت" کی موجودگی کے باوجود "شہوانی جذبات" سے خالی، "نفسانی خواہشات" سے لاعلم "لذّتِ اتّصال" سے ناآشنا، "جسمانی مزے داریوں" سے بے خبر اور "جنسی تعلق" سے بے پروا، باغ اور جنگل میں رہتے تھے۔ اِس زندگی میں اُن کے ساتھ کوئی جھمیلا نہ تھا، بے محنت و مشقت رہنے کو گھر اور بے فکر و تردّد کھانے کو بہترین کھانا پینا مل رہا تھا۔ "یا آدم اسکن" میں "اسکن" بہت بامعنی لفظ استعمال ہوا ہے "سکون" کے معنی حرکت کا جاتے رہنا، ٹھہر جانا ہے، اضطراب نہ ہونے سے جو حالتِ اطمینان پیدا ہوتی ہے اس پر بھی لفظ "سکون" بولا جاتا ہے۔ "آدم" کی زندگی بال بچوں، کھانے پینے، اور ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی کے تردّد، تلاش سے مبرّا اور پاک تھی۔ وہ ایک پُر امن اور باسکون زندگی "باغ" میں گزار رہے تھے، یہ ہی "جنّت" کی زندگی تھی، اور یہ بہت "بلند معیارِ حیات" تھا۔ مگر جب انھوں نے "قربتِ شجرہ" کرلیا، اتّصالِ جسمانی کا مزہ چکھ لیا، "بیوی" کا مصرف جان لیا اور اُس "جنسی تعلق" کو قائم کرلیا جس سے "توالد و تناسل" کا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے تو وہ پہلی "جنّت کی زندگی" اُن سے چھن گئی۔ وہ فردوسِ بہارستان سے نکل گئے۔ گویا ایک بلندی سے نیچے گر پڑے، انسان سے؛ جب کوئی نامناسب اور خلافِ شان حرکت ہو جاتی ہے تو عام طور پر بولتا ہے کہ "میں بڑی بلندی سے گر پڑا"۔ قرآن نے پہلی زندگی کو "بلند معیارِ حیات" قرار دیا ہے اور دوسری زندگی کو "پست دورِ زندگی" سے تعبیر کیا ہے،

اس سلسلے میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب آدم زمین ہی پر تھے اور اُن کی بیوی بھی اُن کے ساتھ ہی تھیں تو پھر انہیں "قربتِ شجرہ" یعنی "جنسی تعلق" قائم کرنے سے کیوں روکا گیا تھا؟ — اور آخر کب تک کیلئے روکا گیا تھا؟ پہلے سوال کا عامیانہ جواب تو، اعتراضی سوال کی شکل میں یہ ہے کہ آج بھی بہت سے گھروں میں لڑکا اور لڑکی دونوں ہی موجود ہوتے ہیں اور اُن کی نسبتیں یا شادیاں بھی بچپنے ہی سے طے یا ہوئی رہتی ہیں، مگر ایک مقررہ عمر اور معین مدت تک، اُن کے والدین انہیں "قربتِ شجرہ" یا "جنسی تعلق" قائم کرنے سے کیوں روکے رکھتے ہیں۔ ؟ صرف اس لئے کہ وہ دونوں بالخصوص لڑکے پوری طرح نشو و نما حاصل کر لیں۔ کوئی درخت بھی جب جوان ہونے سے پہلے ہی پھل دیدیتا ہے تو اُس کا پھل توڑ کیوں دیا جاتا ہے؟ محض اس لئے کہ وہ درخت پوری طرح نشو و نما پانے کے بعد پھلے گا، تو پھل عمدہ اور بڑا ہوگا۔ اور عالمانہ جواب یہ ہے کہ چونکہ آدم کو خلیفۃ الارض یعنی زمین کا حکمراں بننا اور اعلیٰ درجہ کی تمدنی زندگی بسر کرنا تھی اور اس کی تربیت، جنسی تعلق پر ضروری کنٹرول کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے آدم کو ایک مقررہ عمر اور معین مدت تک کے لئے جنسی تعلق قائم کرنے سے روکا گیا تھا، مرد اور عورت کا جنسی تعلق محض ایک طبیعاتی عمل نہیں ہے، جیسے حیوانوں کی طرح بلا حدود و قیود پورا کر لینے سے پچھہ نہ بگڑے، بلکہ اس مسئلہ کا تعلق، انسانیت کی بلند ترین زندگی اور اُس کی تمدنی ارتقاء سے ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر ڈانوِن نے تحقیقات میں ایک عمر گزار کر اپنی علمی و تحقیقی کاوش ایک کتاب کی شکل میں پیش کی ہے جس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ تہذیب و تمدن کا دارو مدار جنسی تعلق کی تحدید و تادیب پر ہے۔ جو قوم جنسی تعلق پر ضروری اور مناسب کنٹرول نہیں رکھتی اُس کی معاشرتی توانائیاں ضائع ہو جاتی

ہیں۔ اور اس لئے وہ تمدّن کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے رہجاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے تاریخ کے اٹل شواہد سے ثابت کیا ہے کہ بہترین تمدّن کی حامل صرف وہی قوم ہوئی ہے جس نے جنسی تعلّق پر مناسب اور ضروری پابندی لگائی تھی، اور ایک خاص عمر و مدت سے پہلے کسی عنوان سے جنسی تعلّق کی اجازت نہ دی تھی، وہ یہ بھی تاریخی حقیقت پیش کرتے ہیں کہ جن اقوام نے جنسی تعلّقات پر حدود و قیود عائد کیں اُن اقوام میں فکر و عمل کی صلاحیّت بہت بڑھی ہوئی پائی گئی ہے، مزید تفصیلات کیلئے اُن کی کتاب "جنسیات اور تمدّن" ملاحظہ فرمایئے۔ رسالہ طلوعِ اسلام (کراچی) کے اکتوبر نمبر ۱۹۵۳ء میں سحر نگار علّامہ پرویز نے بھی ایک خط بنام سلیم میں اس موضوع پر فاضلانہ حیثیت سے روشنی ڈالی ہے اس خط کی ابتدائی سطروں میں علّامہ پرویز نے یہ بھی شکایت کی ہے کہ :۔ "ہمارے یہاں " جنسی تعلّق "کے موضوع کو اس قدر" شجرِ ممنوعہ" سمجھا جاتا ہے کہ شریفوں کی مجلس میں اس کا نام تک لینا بھی بے حیائی تصور کیا جاتا ہے"۔

موضوع سے قطع نظر علّامہ موصوف کو شکایت ہے کہ ہمارے یہاں "جنسی تعلّق" کو "شجرِ ممنوعہ" سمجھا جاتا ہے برخلاف اس کے مجھے یہ شکوہ ہے کہ ہمارے یہاں ابھی تک جنسی تعلّق کو شجرِ ممنوعہ سمجھا ہی نہیں گیا۔ حالانکہ قرآن میں قصۂ آدم میں "جنسی تعلّق" ہی کو شجرِ ممنوعہ کہا گیا ہے۔ بہرکیف! سوال یہ تھا کہ آدم کب تک رُکے رہے؟ سو یہ سوال نہایت معقول اور اہم ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ممانعت، یہ رکاوٹ اور یہ تاکید ہرگز " دائمی " نہ تھی بلکہ " عارضی " تھی۔ مستقل " نہ تھی بلکہ " میعادی " تھی۔ وہ ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ کچھ دن کے لئے جنسی تعلّق قائم کرنے سے روکے گئے تھے، اس آیت کو پھر دیکھئے :۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ إِلَىٰٓ ءَادَمَ مِن قَبْلُ " اور ہم نے آدم سے ایک عہد لیا تھا اس

فَنَسِیَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَہٗ عَزۡمًا " سے پہلے، سو اس نے خلاف معاہدہ کی۔
(طٰہٰ ۷) اور ہم نے اُس میں پختگی نہیں پائی"۔

کہا گیا ہے کہ " آدم " سے " قربتِ شجرہ " کے متعلق ایک " عہد " لیا گیا تھا مگر اُس نے پورا نہ کیا۔ " عہد " کے معنی " وعدہ " " قول و قرار " اور " معاہدہ " کے ہیں۔ جب حضرت ابراہیم کو تمام " بنی نوع انسان " کا " امام " بنایا گیا تو اُنھوں نے فرمایا کہ میری " اولاد " کے لئے بھی حکم صادر کیا جائے چنانچہ اللہ تعالٰے نے فرمایا کہ اچھا، ایسا ہی ہوگا مگر :۔

لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ " میرا یہ معاہدہ اُن لوگوں کے لئے نہیں ہوگا
(بقرہ ۱۵) جو اس کی خلاف ورزی کرنیوالے ہونگے"۔

غور فرمایئے حضرت ابراہیم اور اللہ تعالٰے کے درمیان ایک " معاہدہ " تھا، کہ بنی نوع انسان کی امامت آلِ ابراہیم کو ملے گی جسکی ایک شرط یہ تھی کہ " ظلمین " کے مقابلے میں یہ " معاہدہ " برقرار نہ رہے گا۔ " آدم " کے سلسلے میں بھی یہی دونوں لفظ " عہد " اور ظلمین " آیا ہے۔ آدم سے بھی ایک معاہدہ " ہوا تھا، اور اُن کو بتا دیا گیا تھا کہ تم نے اِس " معاہدہ " کو توڑا تو " ظلمین " میں سے ہو جاؤ گے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ " معاہدہ شکنی " کے مرتکبین کے لئے " ظلمین " آتا ہے اور اسی لئے آدم کے سلسلے میں " فَتَكُوۡنَا مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ " آیا ہے۔ مشرکین مکہ اور رسول اللہ سے جو " معاہدہ " ہوا تھا اُس کو توڑنے کی اللہ تعالٰے نے اجازت دی تو کہا :۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖۤ اِلَى الَّذِيۡنَ " خدا اور اس کے رسول کی طرف سے دستبرداری

عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ہے، اُس معاہدہ سے جو تم نے مشرکین سے کیا تھا"

(براۃ یا توبہ ا)

اور " معاہدہ " ہمیشہ " میعادی " ہوتا ہے، چاہے اُس کی مدت جو بھی ہو۔
چنانچہ کہا گیا ہے :-

فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ " سو اُن کے ساتھ، جن کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا تھا

اِلٰى مُدَّتِهِمْ (توبہ ا) کیا ہو انکی مدت تک، اس معاہدہ کو پورا کر دو"

لہذا " آدم " اور اللہ تعالےٰ کا " معاہدہ " بھی یقیناً " میعادی " تھا یعنی " دائمی "
نہیں بلکہ " وقتی " اور " عارضی " اور ایک " معیّن مدت " کے لئے تھا اور
تھوڑے دنوں تک " آدم " کو " قربتِ شجرہ " سے عارضی طور پر روکنے
کی مصلحت یہ اور صرف یہ تھی کہ " عورت " اور " مرد " دونوں کچھ اور پختہ عمر کے
ہو جائیں۔ تب اُن میں " جنسی تعلّقات " قائم ہوں، تاکہ " نسلِ انسانی "
زیادہ توانا اور مضبوط شکل میں جلوہ گر ہو۔ آج بھی جن لوگوں کی شادی کم عمری
میں ہو جاتی ہے، دیکھ لیجیے، ان کی اولاد کس قدر کمزور اور مریض ہوتی ہے۔
یورپ کے لوگ ایشیا والوں سے زیادہ مضبوط جسم و قویٰ اور دماغ کے اس لئے
ہوتے ہیں کہ وہاں کے مرد بالعموم ۴۰ سال کی عمر میں شادی کرتے ہیں، نیز اولادِ آدم " کو
" زمین کا حکمراں " (خلیفۃ الارض) بننا تھا۔ اور کم سن حاکم اپنی ناتجربہ کاری
کم عمری، کمزوری، کم عقلی وغیرہ کے سبب، امورِ حکومت اور کاروبارِ سلطنت کو
بہترین طریقے پر انجام نہیں دے سکتا۔ آج تک جتنے نو عمر حاکم ہوتے ہیں انھوں
نے ویسی عمدہ جہانبانی نہیں کی ہے جیسی پختہ عمر والے حکمرانوں نے کی ہے۔

اسی لئے "نبوّت" بھی "پختہ عمری" ہی میں، بالعموم چالیس۴۰ برس کی عمر ہو جانے کے بعد ہی پیغمبروں کو عطا ہوتی تھی

قدیم حکماء نے کم عمری میں جنسی تعلق کو انحطاطِ نسل اور کوتاہی عمر کا باعث قرار دیا ہے۔ افلاطون نے کہا ہے کہ چالیس سال کی عمر سے پہلے کسی مرد کو کسی عورت سے جنسی تعلق نہ قائم کرنا چاہئے، کیونکہ اس صورت میں جو اولاد ہوگی وہ کمزور ہوگی۔ امریکن محققین نے بہت کچھ تحقیق کے بعد یہ اعلان کیا ہے کہ جس قدر نامی گرامی اشخاص گذرے ہیں وہ بالعموم اپنے والدین کی پچھلی اولاد تھے۔

علّامہ آزاد نے "ترجمان القرآن" جلد دوم صفحہ ۱۵۱ پر لکھا ہے کہ

"تمام علماء اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی ۴۰ سال کا زمانہ، اُس کے اخلاق و خصائل کے اُبھرنے اور بننے کا اصلی زمانہ ہوتا ہے۔"

قرآن نے بالعموم نابالغوں کے ولیوں اور منتظمینِ جائداد سے کہا ہے کہ وہ نابالغوں کی جائداد اُن کو اُس وقت حوالہ کریں:۔

(۱) حَتّٰٓی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ (نساء۶) "جب کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔"

(۲) حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (بنی اسرائیل ۴) "جبکہ وہ پوری جوانی کو پہنچ جائیں۔"

حضرت یوسفؑ پر لکھا ہے اُس وقت ڈورے ڈالے:۔

لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ (یوسف ۳) "جب کہ وہ پوری جوانی کو پہنچے۔"

اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نکاح کی عمر وہی ہے جب مرد اپنی پوری جوانی کو پہنچے، قرآن نے یہ عمر ۴۰ سال ظاہر کی ہے:۔ حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً "(احقاف ۲) "جب کہ وہ پوری جوانی کو پہنچتا ہے اور چالیس سال کا ہوتا ہے۔"

"کتخدائی" کے مورخ پال گائیڈ (Paul Gide) نے لکھا ہے کہ :-

"چوتھی صدی کے پادریوں میں یہ مسئلہ مسلم قرار پا گیا تھا کہ آدم کے پہلے گناہ سے مباشرت اور کتخدائی کی بنیاد پڑی، ورنہ خدا تعالے تخلیق اور افزائش نسلِ انسانی کا کوئی اور ہی طریقہ رکھتا۔"

کون جانے کہ کیا ہوتا ؟ مگر اتنا ضرور ہے کہ آدم کی جلد بازی ہمیشہ کے لئے یہ ریمارک ہو گیا کہ :-

كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (بنی اسرائیل ۲) "انسان بڑا ہی جلد باز ہے"

ہمارے نظام شمسی کا کوئی مہیب و مُدار ستارہ جب ہمارے عظیم سورج سے ٹکرایا اور اُس کی رگڑ کے اثر سے، سورج نے، ایک آتشیں گولہ، اپنی آغوش سے نکال کر دُور پھینکا تو وہ سورج سے "۹۳۰۰۵۰۰" میل دُور جا کر دُوسرے سیاروں کی کشش سے، معلق ہو گیا[۱]۔ اور اس نے بعد میں، "کرۂ زمین" کا لقب پایا۔ مگر یہ "کرہ" اُس وقت "خاکی" نہیں "آتشی" تھا، وہ دہکتی ہوئی آگ کا ایک بے پناہ سمندر تھا، کچھ عرصہ کے بعد جب اُس کی بالائی سطح اُوپر کی طرف سے دھیمی ہونی شروع ہوئی تو وہاں آثارِ حیات نے بھی جنم لینا شروع کیا۔ مشیت کی مشین حرکت میں آگئی اور کارکنانِ قضا و قدر کام میں لگ گئے، خدا کے حکم سے نہ صرف وہ تمام مہیب "طاقتیں" اس کرہ پر

---

[۱] نو کروڑ تیس لاکھ پانچ ہزار میل کا فاصلہ ہے جو سورج اور زمین کے درمیان ہے۔

مخلوق وہویدا ہوئیں ، جو آج تک قوانینِ الٰہیہ کے مطابق نظامِ عالم میں سرگرمِ عمل اور کارفرما ہیں بلکہ ایک مستقل مخلوق بھی اسی تپتی ہوئی آگ سے پیدا کی گئی ، یہ "جِنّ" تھے :-

خَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (رحمٰن ۱) "اور جنات کو ہم نے خالص آگ سے پیدا کیا ۔"

یہ "آتشی مخلوق" نہایت طاقتور مخلوق تھی اور چونکہ ساری "طاقتوں" میں یہی ایک طاقت ، صاحبِ اختیار و ارادہ تھی ، اس لئے یہ مخلوق زمین پر لامحالہ حکمراں ہوگئی ، اسی کی "مونوپلی" قائم ہوگئی اور اسی مخلوق کے سر پر "خلافتِ ارضی" کا سہرہ بندھ گیا ۔

پھر جب اِس کرۂ آتشی کے گرد کے بخارات دُور ہو گئے اور "زمین" یا اس کرۂ آتشی "کی بالائی سطح بالکل ٹھنڈی ہو گئی اور اس پر اس کی کثافت کے مطابق آب و خاک کی سطحیں جمیں تو بتدریج نشو و نما پا کے ایک ، دوسری خاکی مخلوق جلوہ گر ہوئی ، یہ "انسان" تھے :-

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ - (مومنون ۱) "اور بلاشبہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا ۔"

مگر یہ "خاکی مخلوق" بہت بعد میں جلوہ گر ہوئی ، اس سے پہلے اس زمین پر ایک "آتشی مخلوق" موجود تھی ۔ اِس طور پر اب "زمین" پر صاحبِ ارادہ واختیار دو مخلوق ہو گئی ۔ مگر ان دونوں میں زیادہ بہتر "خاکی مخلوق" تھی کیونکہ وہ قدرت کی طرف سے ہر چیز کا "نام" رکھنے کی صلاحیت لیکر ابھری تھی :-

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا " آدم کو ہم نے ساری چیزوں کا

(بقرہ ۴) نام رکھنے کا علم دیدیا ــ"

آج بھی آپ دیکھیں گے کہ جب کوئی بچہ بولنے کی ابتداء کرتا ہے تو وہ " نام " سے کرتا ہے ـ وہ نہ صرف " ابّا " اور " اماں " پہلے بولتا ہے بلکہ خود بھی " نام " رکھنے لگتا ہے ـ مثلاً " پانی " کا نام وہ " مم " رکھتا ہے ـ بول وبراز کا نام وہ " چھی " رکھتا ہے ــ یہ " نام " رکھنے والی صلاحیت کرۂ ارضی کی کسی طاقت اور مخلوق میں نہ تھی ـ نہ اُن فرشتوں میں جو " مدبراتِ امر " (نٰزعٰت ا) اور " مقسماتِ امر " (ذٰریٰت ا) تھے ـ اور نہ " جنات " ہیں جو اُس وقت، صاحب اختیار وارادہ ہونے کے سبب، زمین کے واحد حکمراں بنے ہوئے تھے ـ لہٰذا " انسان " سے سب کو دبنا پڑا ـ اور اب " انسان " کی اِس صلاحیت کے سبب، پروگرام کے مطابق مشیتِ الٰہی نے " زمین " کی خلافت " انسان " کے حوالے اور سپرد کر دینی چاہی ـ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ " زمین " کی تمام دوسری " طاقتوں " یا " مخلوق " کو انسان کے لیے مسخّر اور اُس کے تابع کر دیا جائے ـ لہٰذا بلا استثناء ساری " طاقتوں " کے نمائندوں کو حکم ہوا کہ وہ " انسان " کے نمائندہ " آدم " کے آگے سر اطاعت خم کر دیں :-

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ " اور بلاشبہ ہم نے انسان کو بجتی ہوئی صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ مٹی سے بنایا ہے جو سڑے گارے کی تھی وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ اور اس سے پہلے لُو کی آگ سے جنات

مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۝ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (حجر ۳)

کو پیدا کر چکے تھے، اور جب کہ تمہارے رب نے "ملائکہ" سے کہا کہ میں بجتی ہوئی مٹی سے جو سڑے گارے کی ہوگی ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں، ہو جب میں اسکو بنا چکوں اور اُس میں اپنی روح میں سے کچھ پھونکدوں تو تم سب اُس کے آگے جھک جانا ۔"

"ملائکہ" سے مراد کیا ہے؟ اس کو واضح طور پر پھر سمجھ لیجئے ۔ سورۂ سجدہ کی آیت آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ اللہ وہ ہے جو :۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (سجدہ ۱)

" وہ تدبیر امور کرتا ہے آسمان سے لے کر زمین تک ۔"

لہذا "اصلی قوت" تو ایک ہی ہے، جس کے ہاتھ میں نظامِ کائنات کی ڈوری ہے، مگر اُس قوت کی وسعت سے، ہر جگہ بہت سی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں اور اسی وجہ سے اُن کے نام علیحدہ علیحدہ ہوگئے ہیں ۔ مثلاً ایک "قوت" وہ ہے جو سمندر کے بخارات آسمان پر لے جاتی ہے ۔ ایک "قوت" وہ ہے جو اُنھیں منجمد کر کے برف کی صورت میں کر دیتی ہے، ایک وہ قوت ہے جو ان میں برق و رعد کی آوازیں پیدا کر دیتی ہے ۔ ایک وہ قوت ہے جو پانی کو زمین پر لاتی ہے ۔ ایک قوت وہ ہے جو روئیدگی کی خدمت انجام دیتی ہے، ایک قوت وہ ہے جو پہاڑوں اور کانوں میں ہر ہر قسم کی دھاتیں یا سمندر

یں موتی بناتی ہے۔ ایک قوت وہ ہے جو مخلوق کو سمیع و بصیر بناتی ہے۔ ایک قوت وہ ہے جو بے روح جسموں کو زندگی بخشتی ہے، ایک قوت وہ ہے جو ساکنانِ زمین پر برق و باد کی آفت ڈھاتی ہے۔ کوئی قوت باغ کو سیارتی ہے، کوئی قوت سبزہ زاروں کو ویران اور اجاڑ بناتی ہے، ایک قوت وہ ہے جو لاکھوں میل سے انسانی آوازوں کو چشم زدن میں ساری دنیا میں پھیلاتی ہے، ایک قوت وہ ہے جو انسانوں کو ہوا میں یہاں سے وہاں پہونچاتی ہے غرض کائنات میں کروڑوں "طاقتیں" ہیں جو اصلی طاقت رکھنے والے خدا کے حکم اور قانون کے مطابق اپنے اپنے فرائض، مقررہ وقتوں پر انجام دے رہی ہیں۔ ان ہی طاقتوں کو "ملائکہ" کہا گیا ہے، دوسری جانب ایک خاص قسم کی آتشی مخلوق زمین پر ایسی قوت والی پہلے سے موجود ہے جو صرف طاقت ہی نہیں اور مذکورہ بالا تمام طاقتوں کی طرح، بے اختیار و ارادہ نہیں بلکہ صاحب ارادہ ہے، اوّل الذکر طاقتوں کے مثل "جذبات" سے خالی نہیں ہے بلکہ جذبات کی حامل ہے، جس زمین پر "آدم" کی حکومت ہونے والی ہے اُس پر پہلے سے وہ حاکم ہے، اسی لئے وہ پہلے ہی سے مخالف ہے کہ "انسان" یا کوئی دوسری مخلوق اس شان کی نہ پیدا کی جائے کہ وہ "خلافت و حکومت" کی حامل و مالک قرار دی جائے، لہٰذا ضروری تھا کہ ان سب طاقتوں کو "آدم" کے آگے جھکا دیا جائے۔ انسان کی علمی صلاحیت کے سامنے وہ سر بسجود ہو جائیں اگر بشر اُن کی خدمتوں کی ضرورت محسوس کرے تو وہ سرتابی نہ کریں۔ بلکہ اُس کے حکم پر چلیں، لہٰذا اُن ساری قوتوں کے "نمائندوں" کو حکم دیا گیا کہ وہ

"آدم" کو سجدہ کریں۔ ان ہی "نمائندوں" کو "ملائکہ" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ورنہ "فرشتے" نہ تو جسم رکھتے ہیں کہ زمین پر پیشانی ٹیک کر سجدہ کریں۔ اور نہ فرشتے کسی بھی انسان کے محکوم، مطیع اور فرمانبردار ہیں کہ انھیں آدم کے سامنے اظہار اطاعت و انقیاد کا حکم دیا جاتا۔ "فرشتہ" (مَلَک) ایک جدا مخلوق ہے۔ اس سے الگ کائنات میں لاتعداد طاقتیں، کروڑوں قوتیں، اور بے شمار مخلوق موجود اور کارفرما ہیں اگر یہ سب، انسان کے لئے مسخر اور اطاعت گذار نہ بنائی جاتیں تو انسان خلافتِ ارضی کیسے چلا سکتا تھا؟ لہذا "ملائکہ" سے مراد یہاں پر "فرشتے" نہیں بلکہ ساری وہ طاقتیں اور مخلوق ہیں جو اس کائنات میں موجود ہیں۔ "جن" بھی ایک طاقت ور مخلوق ہونے کے سبب دوسری تمام مخلوق اور طاقتوں میں شامل ہے اور ان تمام قسم کی طاقتوں کے "نمائندوں" کو، جمع کے صیغے میں "ملائکہ" سے تعبیر کیا گیا ہے اگر مخاطب صرف "فرشتے" ہوتے تو یہ کُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ، کی کیا ضرورت تھی؟ اور جن اس میں کس طرح گھس پڑتا؟۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ "سو سارے "ملائکہ" نے سر اطاعت
اَجْمَعُوْنَ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط اَبٰٓى خم کردیا، نہیں کیا تو ابلیس نے، اس
اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ۔ نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ سر اطاعت
جھکا دینے والوں میں شامل ہو" (حجر ۳)

"ملائکہ" ساری طاقتوں کے "نمائندوں" کو کہا گیا ہے، "جنات" بھی ایک طاقت ور مخلوق ہے لہذا ان کا نمائندہ (ابلیس) بھی "ملائکہ" میں داخل تھا۔ چنانچہ جب "سجدہ" سے متعلق بازپرس ہوئی تو اس میں بھی ظاہر کیا گیا کہ وہ

شامل تھا :۔

مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسۡجُدَ اِذۡ "کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ

اَمَرۡتُكَ ؕ (اعراف ۲) میں نے تجھے حکم دیا تھا ۔ ؟ ۔"

اگر "ملائکہ" میں وہ داخل نہیں تھا تو "اَمَرۡتُكَ" (میں نے تجھ کو حکم دیا تھا) کا اطلاق ابلیس پر کیسے ہوسکتا ہے ؟ پھر ابلیس کے جواب سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو "ملائکہ" سے باہر نہیں سمجھتا تھا :۔

(۱) قَالَ لَمۡ اَكُنۡ لِّاَسۡجُدَ لِبَشَرٍ "اُس نے کہا کہ میں ایسا نہیں کہ

(حجر ۳) "بشر" کو سجدہ کروں "

(۲) قَالَ اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡهُ (اعراف ۲) "وہ کہنے لگا کہ میں اس سے بہتر ہوں"

اِن جوابوں سے بلا تکلف اور تردد صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے کو "ملائکہ" سے باہر نہیں سمجھتا تھا ظاہر ہے کہ جب یہ جن بھی ملائکہ میں داخل تھا تو یہاں پر لفظ "ملائکہ" بمعنی فرشتہ نہیں آیا ہے اس سے مراد کائنات کی تمام طاقتیں ہیں ـــــ بہرکیف ! حکم سجدہ پر جنات کے نمائندے ابلیس کے علاوہ، ساری طاقتوں کے نمائندوں نے سر اطاعت جھکا دیا "جنات" کے علاوہ دیگر طاقتیں محض مشینی طاقتیں تھیں، جن کے اعمال میں اپنے ارادہ و اختیار کا کوئی دخل نہیں، جو کہا گیا اور جیسے حکم دیا گیا، اس کو ویسے ہی وہ کرنے لگے ۔ لہذا ان تمام طاقتوں کے نمائندوں نے تو "انسان" کی یہ "نام" رکھنے والی "علمی صلاحیت" کو معیارِ افضلیت تسلیم کر کے اُس کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا ۔ البتہ "جنوں" کے نمائندہ "ابلیس" نے "انسان" کے نمائندہ "آدم" کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا، کیونکہ یہ جس مخلوق کا

نمائندہ تھا وہ صاحبِ طاقت ہی نہیں بلکہ صاحبِ اختیار و ارادہ مخلوق بھی تھی اور صاحبِ اختیار و ارادہ مخلوق ہونے کے سبب " زمین " پر اس کی حکمرانی اور مونوپلی قائم تھی۔ بھلا یہ مخلوق اُس " انسان " کے سامنے کیسے جُھک سکتی تھی جو بربنائے عناصر ترکیبی اُس سے افضل و برتر نہ تھی؟ جو اس کی حکمرانی کو ختم کرنے والی تھی؟ جو اس کی مونوپلی کو چھین لینے والی تھی؟ آج بھی کسی سرزمین کی قدیم آبادی، جدید الورود لوگوں کی آسانی سے اطاعت قبول کرتی ہے؟ اگر کبھی کسی مجبوری سے موالات پر مجبور بھی ہوتی ہے تو کیا وہ نئے آنے والوں سے محبت و دوستی بھی کرتی ہے؟ وہ تو دشمن بن جاتی ہے، چنانچہ " جنات " نے بھی " انسان " کو گوارا نہ کیا۔ اسی لئے اُس نے تخلیقِ انسان کی اسکیم ہی سُنکر اعتراض کیا تھا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ " فرشتوں " نے اعتراض کیا تھا، کہ " انسان " کو پیدا نہ کیا جائے، حالانکہ وہ بےچارے تو سراپا تسلیم و رضا ہیں وہ مخالفت کیا جانیں:۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ	" اور جبوقت تمہارے رب نے ملائکہ
فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ	سے کہا کہ میں زمین پر ایک حکمران بنانیوالا
فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ	ہوں تو انھوں نے مخالفت کی کہ کیا تو
وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ	ایسے لوگوں کو پیدا کرے گا جو فسادی
نُقَدِّسُ لَكَ ۔	ہوں گے، اور خون خرابہ کے شوقین؟
(بقرہ ۴)	ہم تو تسبیح و تقدس کے لئے ہیں ہی ۔"

اعتراف و اعتراض اور تسلیم و مخالفت کا تعلق " جذبات " سے ہے، اعتراض

سے ظاہر ہے کہ یہ مخالفت اُس ہی کی طرف سے تھی جو " جذبات " رکھتے تھے
جو " انسان " کی پیدائش میں اپنا نقصان دیکھتے تھے ۔ جن کو گوارا نہ تھا کہ میرے
سوا " زمین پر " کوئی " خلیفہ " بن سکے ۔ " فرشتے " نہ تو " جذبات " رکھتے
ہیں ، نہ اختیار و ارادہ " اور نہ " بشر " کی تخلیق سے اُن کا کوئی نقصان یا اس
کی عدم تخلیق سے اُن کا کوئی فائدہ تھا ۔ لہٰذا وہ کیا مخالفت کرتے ؟ دراصل
یہ مخالفت جنات کی طرف سے تھی ، جن کا " آدم " کی پیدائش سے نقصان متصور تھا۔
چنانچہ دیکھئے نا کہ جب بات نہ مانی گئی اور انسان پیدا ہی کر دیا گیا اور پھر اُس کے
سامنے جھکنے اور اُس کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا تو " جنوں " کا نمائندہ آگ بگولہ
ہوگیا ، کس شوخی اور جذباتی انداز سے ابلیس، اللہ کو مخاطب کرتا اور کس حقارت
سے " انسان " کا ذکر کرتا ہے :۔

قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ؕ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ؕ (بنی اسرائیل)
" کہنے لگا کہ میں اُسکے سامنے جھکوں جسکو تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے؟ کہنے لگا کہ ذرا دیکھ تو کیا یہی وہ ہے جسکو تو نے ہم پر فضیلت دی ہے؟

چنانچہ " جنوں " کے نمائندہ " ابلیس " نے نہ صرف بڑھ بڑھ کر بناتے آن اور تکبر " انسان "
کی اطاعت سے انکار کر دیا اور خدا کے حکم سجدہ کو بھی ٹھکرا دیا :۔

اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ؗ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ " اس نے گوارا نہ کیا اور تکبر کیا اور منکرین میں سے ہوگیا ۔ "
(بقرہ ۴)

بلکہ " خلافت ارضی " چھن جانے اور " زمین " پر " انسان " کا قبضہ ہو جانے
سے وہ " انسان " کا ہمیشہ کے لئے دشمن بھی بن گیا ۔ اور چوری چھپے نہیں کھلم کھلا :۔

(۱) رَبِّ فَانْظِرْنِیٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۔ ” اے میرے پروردگار! مجھے قیامت تک کی مہلت عطا کر۔“ (حجر ۳)

(۲) قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۔ ” اس نے کہا کہ تیری عزت و جلال کی قسم، سب کو اکھاڑ پھینکونگا۔“ (ص ۵)

یہ ” اکھاڑ پھینکنا “ اس لیئے تھا کہ اس کا خود اللہ تعالےٰ پر یہی چارج تھا کہ اللہ نے اُسے اُکھاڑ پھینکا ہے:۔

فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ ” سو جیسا کہ تُو نے مجھے اکھاڑ پھینکا ہے“ (اعراف ۲)

” غَوٰی “ کا ترجمہ لوگ یہاں پر بھی ” گمراہ “ کرتے ہیں حالانکہ اس کا کوئی محل نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے ” ابلیس “ یا اُس کی قوم کو کب اور کیسے اور کیا گمراہ کیا تھا؟ ”غوٰی“ کے معنی کسی کو اُس کے مقام سے ہٹا دینا ہے۔ اِسی سے ”اغوا“ ہے جو عام طور پر بولا جاتا ہے۔ متذکرہ بالا دونوں آیتوں میں، اسی معنی میں ” غوٰی “ آیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں بھی ” آدم “ کے بارے میں جو کہا گیا ہے کہ ” فَغَوٰی “ سو وہاں بھی یہی مطلب ہے، کہ ”وہ اپنے مقام سے اُکھڑ گیا“۔ چونکہ ابلیس ” جنّات “ کا نمائندہ تھا اور ” انسان “ سے پہلے کرۂ ارضی پر اسی قوم کی حکومت تھی اور اللہ تعالےٰ نے اُس کو ”خلافت ارضی“ کی کرسی سے ہٹا کر زمین کی خلافت ” انسان “ کے حوالے کر دی تھی، اس لیئے اُس نے اللہ پر ” غوٰی “ کا چارج لایا۔ یعنی یہ کہ اللہ تعالےٰ نے اُس کو اُس کے مقام سے اُکھاڑ پھینکا۔ پھر ابلیس نے جو انسانوں کے متعلق بھی قیامت تک کی مُہلت لیکر اُن کے متعلق ” لَاُغْوِیَنَّهُمْ “ کہا ہے، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ،

"جنات"، اِس درمیان میں ہمیشہ "انسان" کو اُکھاڑ پھینکنے کی کوشش کرتے رہیں گے، کیونکہ وہ "خلافتِ ارضی" لے لینے کے سبب "انسان" کے ازلی وابدی دشمن ہیں :۔

اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا (بنی اسرائیل ۲) "یقیناً شیطان، انسان کا صریح دشمن ہے ۔"

بہرکیف! اس سوال و جواب کے بعد "جنات" نے "خلافتِ ارضی" کی کرسی "انسان" کے لئے خالی کر دی۔ اور وہ پیچھے ہٹ گئے :۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا (حجر ۳) "ہم نے کہدیا کہ بس اب تو ہٹ، نکل یہاں سے"

"کمتر" کو "افضل" کے لئے جگہ خالی کرہی دینی پڑتی ہے۔ "متمدن" یوروپینوں نے جب "امریکہ" کی سرزمین پر قدم رکھا تو غیر متمدن قدیم "امریکنوں" کو ہٹ جانا ہی پڑا۔ "ہندوستان" میں جب "آرین" پہونچے تو "دراویڈین" جنگل میں چلے گئے۔ "انسان" جب آیا تو "جنات" پیچھے ہٹ گئے، اسی لئے ہم اُن کو نہیں دیکھتے مگر وہ ہم کو دیکھتے ہیں :۔

اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۔ (اعراف ۲) "بلاشبہ وہ اور اُس کا قبیلہ تم کو ایسے طور پر دیکھتا ہے جس طور پر تم لوگ اُس کو نہیں دیکھتے ہو ۔"

یہ ہے "ابلیس" اور "آدم" کی سرگذشت ۔ "ابلیس" نمائندہ ہے "جنات" کا ۔ یہ آتشی مخلوق اُس وقت "زمین" پر پیدا ہوئی تھی ۔ جب کہ

وہ شعلہ جوّالہ تھی ۔ یہ ہی مخلوق " حکمراں " تھی ۔ تخلیقِ " آدم " پر اسی قوم نے اعتراض کیا تھا محض اس لئے کہ انھوں نے سن لیا تھا کہ وہی " خلیفۂ ارضی " بنایا جائے گا ۔ انھوں نے " تسبیح و تقدیس " کا بھی راگ گایا، مگر کچھ نہ سنا گیا ، کیونکہ یہ معترض مخلوق ہر چیز کا " نام " رکھنے کی علمی صلاحیت سے محروم تھی ۔ " آدم " نمائندہ ہے " انسان " کا ، یہ خاکی مخلوق " زمین " پر اس وقت پیدا ہوئی جب زمین ٹھنڈی ہو چکی تھی ، اور اس پر مٹی ' پانی نے وجود پالیا تھا ۔ جب یہ مخلوق ہویدا ہوئی تو " جنّات " ہٹ گئے ۔ اس لئے ہم اُن کو نہیں دیکھتے ، اور چونکہ وہ خلافتِ ارضی چھن جانے سے " انسان " سے ناراض ہیں ، اس لئے اُنھوں نے " انسان " کی اطاعت قبول نہیں کی ۔ یہی وجہ ہے کہ انسان برق و باد پر تو قادر ہیں مگر " جنّات " اُن کی دسترس سے باہر ہیں ۔

یہ " جنّات " ایک مستقل مخلوق ہیں ۔ ان کے " قبیلے " ہیں ان کی " اولاد " ہے ان کے " لاؤ لشکر " ہیں :-

(۱) وَجُنُودُ إِبْلِيسَ أَجْمَعُونَ " ابلیس اور اس کے لاؤ لشکر سب ہی دوزخ میں ڈالے جائیں گے "
(شعرا ۵)

(۲) أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ " سو پھر بھی تم نے ابلیس کو اور اس کی اولاد کو دوست بنا لیا ہے مجھ کو چھوڑ کر حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں ۔ "
(کہف ۷)

(۳) وَأَجْلِبْ عَلَيْهِم بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ " اور تو اپنے لشکر کے سواروں اور پیادوں سے اُن پر حملہ کر کے بھی دیکھ لے ۔ "
(بنی اسرائیل ۷)

(۴) اِنَّهٗ یَرٰکُمۡ هُوَ وَقَبِیۡلُهٗ مِنۡ حَیۡثُ لَا تَرَوۡنَهُمۡ (اعراف ۳) "وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں ایسے طور پر دیکھتا ہے کہ تم لوگ ان کو نہیں دیکھتے۔"

لوگ جب "قرآن" میں پڑھتے ہیں کہ "ملائکہ" کو "سجدہ" کا حکم ہوا تو سبھوں نے سجدہ کیا سوائے "ابلیس" کے، تو حیران ہو جاتے ہیں، کہ "ابلیس" تو "جنّ" تھا۔ اس کو "ملائکہ" کیسے کہا گیا؟ پھر جب آگے پڑھتے ہیں کہ "آدم" کو بہکایا "شیطٰن" نے، تو اور بھی حیران ہوتے ہیں کہ "سجدہ" سے انکار تو "ابلیس" نے کیا تھا، پھر یہ "شیطٰن" کیا ہے؟ کچھ اور آگے بڑھ کر جب بار بار قرآن میں لوگ "شیطان" کی جمع "شیاطین" پڑھتے ہیں، اور اس کی "ذرّیت" کا، اس کے "قبیلے" کا اور اس کی "فوج" اور "لاؤلشکر" وغیرہ کا ذکر پاتے ہیں تو اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ کہ آخر قصّہ کیا ہے؟ کیا "شیطٰن" کے بیوی بچّے بھی ہیں؟ لاؤلشکر بھی ہیں؟ حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ "ملائکہ" سے مُراد یہاں پر "فرشتے" نہیں۔ "ملائکہ"، جمع ہے "مَلَک" (فرشتہ) کی بھی اور "مالِک" (طاقت والا) کی بھی۔ قرآن نے اُن تمام قوّتوں کے نمائندوں کو "ملائکہ" کے لفظ سے یاد کیا ہے، جو کائنات کے نظم و نسق میں سرگرم عمل یا مادّی و غیر مادّی مخلوق کی شکل میں موجود ہیں۔ چونکہ "انسان" سے پہلے "آگ" سے پیدا کی ہوئی مخلوق "جنّ" بھی ایک طاقت ور مخلوق ہے، اس لئے اُس کی بھی طاقت کو دوسری اور طاقتوں میں شمار، تسلیم اور شامل کر کے اُن کے نمائندوں کے لئے "ملائکہ" کا جامع لفظ استعمال کیا گیا۔ اور اسی لئے "جمع کا صیغہ"

استعمال کیا گیا۔ اور "طاقتوں" نے تو "انسان" کے آگے سر جھکا دیا۔ مگر "جناتی طاقتوں" کے نمائندہ ابلیس نے انکار کر دیا "ابلاس" اُس غم کو کہتے ہیں جو شدتِ نا امیدی سے پیدا ہو۔ چونکہ "جنوں" کا یہ نمائندہ، مع اپنی اُس قوم کے، جس کا یہ نمائندہ تھا۔ "خلافتِ ارضی" اور "رحمتِ الٰہی" دونوں سے نا اُمید ہو کر ہمیشہ کے لئے غمگین ہو گیا، اس لئے انکارِ اطاعت کے بعد اُس کو "ابلیس" کہا گیا۔ یہ دراصل "جنات" کے اُس نمائندے کا لقب ہے جس کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اور "شیطان" کا مادّہ "شطن" ہے۔ "شطن" کے معنی "لمبی رسّی" کے ہیں۔ چونکہ "جنات" کا یہ نمائندہ "ابلیس" مع اپنی قوم کے، بہ لحاظ "قدامت" بھی اور بہ اعتبار "قومیت" بھی، ایک سلسلۂ دراز رکھتا ہے۔ یعنی بہ اعتبار "حیات" کے اُس وقت سے ہے جب سے "زمین" قائم ہے، اور بہ لحاظ تعداد کے، ساری زمین پر رواں دواں ہے، اس لئے اُس کو "شیطان" بھی کہا گیا۔ چونکہ "ابلیس" اُس مخصوص نمائندہ کا مخصوص لقب ہو گیا اسی لئے اس کی جمع ایک جگہ بھی، قرآن میں کہیں پر نہیں آئی۔ مگر "شیطان" کی حیثیت سے وہ اور اُس کی پوری قوم "جنات" مساوی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے قرآن میں برابر اُس کی جمع "شیاطین" آئی ہے۔ اِس سے مُراد ساری قوم "جنات" ہے، بھلا اکیلا "ابلیس" ساری دنیا کے افرادِ انسانی کو کیسے بہکا سکتا تھا۔؟ اگر ساری دنیا کی، محض ایک گھنٹہ کی، انسانی بداعمالیوں اور بدکرداریوں کو شمار کیا جائے تو لاکھوں تک تعداد پہنچے گی۔

اور کوئی فردِ انسانی بغیر کسی خارجی تحریک کے چوری، ڈکیتی، زنا، قتلِ عمد، عصمت دری، دروغ حلفی، فریب بازی، خودکشی وغیرہ قسم کے جرائم یا کوئی بُرا کام کر ہی نہیں سکتا، پھر کیا تنہا ایک "ابلیس" بہ یک وقت ہر جگہ موجود رہتا اور ہر شخص کو بہکاتا ہے؟ یہ صفت تو خدا اور صرف خدا کی ہے کہ وہ ہر وقت ہر جگہ اور ہر امر میں موجود ہو۔ دراصل وہی آتشی مخلوق "جنّ" ہی جو ہر جگہ یہ خدمت انجام دیتی ہے۔ "شیاطین" اور "ابلیس کی ذُرّیت وجنود" سے یہی مُراد ہیں "ابلیس" صرف اُن کا وہ نمائندہ ہے جس نے انکارِ سجدہ کیا تھا۔ یہ سمجھنا قطعاً باطل ہے کہ "شیطان" ہر جسم انسانی میں داخل ہے، یا خون میں دَوڑ رہا ہے۔ یا نفس کی شکل یا سایہ کی صورت میں ساتھ ساتھ ہے۔ یہ آتشی مخلوق "جنّ" انسان سے بلاشبہ طاقتور زیادہ ضرور ہے، اور آتشی ہونے کے سبب ہماری انسانی نگاہوں سے اوجھل بھی، مگر اس میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ ہمارے جسم میں داخل ہوجاتے یا رُوح میں حلول کرجاتے، بلاشبہ وہ انسان کو بہکا دینے کی پوری طاقت رکھتے ہیں۔ اور بہکا دیتے ہیں، مگر ایسا نہیں ہے کہ سارے افرادِ انسانی ہی پر اُن کا قابو ہوجاتے، اگر ایسا ہوتا تو قرآن یہ نہ کہتا کہ اس سے مومن بندے محفوظ رہیں گے، "ابلیس" نے جس وقت اعلانِ دشمنئ انسان کیا تو اُس نے بھی یہ استثناء کی تھی کہ:-

لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (حجر ۳) "میں سب کو اُکھاڑ پھینکونگا مگر ہاں اُنکو نہیں جو تیرے مخلص بندے ہوں گے"۔

اور خود اللہ تعالیٰ نے بھی فرما دیا تھا کہ تجھ کو جو کچھ کرنا ہو کر دیکھ مگر :-

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ (حجر ۳، بنی اسرائیل ۷) "بلاشک" میرے "جو بندے ہونگے اُن پر تیرا قابو ہرگز نہ چلے گا ۔"

ہاں البتہ جو خدا کا بندہ نہ بن کر دوسرے کا بندہ بن جاتا ہے اُس کے پیچھے ایک شیطن ضرور لگ جاتا ہے :-

وَمَن يَعْشُ عَن ذِكْرِ الرَّحْمَٰنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ۔ (زخرف ۴) "اور جو شخص اللہ کی نصیحت کیطرف سے اندھا بن جاتا ہے ہم اُس پر ایک شیطان مُسلط کر دیتے ہیں جو اُس کے ساتھ رہتا ہے"

"ابلیس" جنات میں کی وہ مخصوص ذات تھی جس نے بہ حیثیت نمائندہ یا سردارِ جنات، آدم کے سامنے سرِ اطاعت جھکانے سے انکار کر دیا تھا، یہ مخصوص ذات ممکن ہے ختم ہو گئی ہو، کیونکہ قرآن میں "ابلیس" سے پناہ مانگنے یا ابلیس پر لعنت بھیجنے کا کہیں پر حکم نہیں دیا گیا ہے بلکہ "شیطن" سے پناہ مانگنے کا حکم آیا ہے

فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۔ "سو شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ مانگا کرو ۔"
(نحل ۱۳، اعراف ۲۴، حم سجدہ ۵)

دراصل یہ جنات ہیں جن کو اُن کے سلسلۂ دراز کے سبب "شیطن" کہا گیا ہے اور اسی لئے قرآن میں اس کی جمع "شیاطین" بار بار استعمال ہوئی ہے، یہ مخلوق انسان سے جدا ایک مستقل مخلوق ہے اور قیامت تک موجود رہے گی، اگر ایسا نہ ہوتا کہ وہ قیامت تک موجود رہے گی تو اُن کا نمائندہ یا سردار "ابلیس" نہ تو قیامت تک کی مہلت خود طلب کرتا اور نہ اللہ تعالیٰ ہی اُس کو قیامت تک کی مہلت دیتا ۔

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ○ " ابلیس نے کہا کہ اے میرے پروردگار! مجھ کو قیامت کے دن تک کی مہلت دے ہم نے
قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ
الْمَعْلُوْمِ - (حجر ۳ - ص ۵) کہا کہ اچھا تجھے اس معین وقت کے دن تک کی مہلت دی جاتی ہے "

غرض جنات " ایک مستقل مخلوق ہے ، انسانوں ہی کی طرح " جہنم " میں بھی دونوں یکساں جائیں گے :-

(۲) وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (اعراف ۲۲) " اور کتنے ہی جن و انس کو ہم نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے -"

پیغبر کو حکم تھا کہ اعلان کر دو کہ :-

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ (بنی اسرائیل ۱۰) " اعلان کر دو کہ اگر تمام جن و انس اکٹھا ہو کر بھی قرآن کا مثل لا سکتے ہوں تو لا دیں ، وہ ہرگز اس کا مثل نہیں لا سکتے -"

" جنات " کی ایک جماعت نے " قرآن " سُنا بھی :-

وَاِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ (احقاف ۴) " اور جب کہ جنات کی ایک جماعت کو ہم تمہاری طرف لے آئے جو قرآن سننے لگے تھے -"

قیامت کے ذکر میں ہے کہ :-

(۱) وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَاۤ اَرِنَا الَّذَیْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِیَكُوْنَا " اور کافر کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں وہ جن و انس دکھا دے جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا ہم انھیں اپنے پاؤں تلے

مِنَ الْاَسْفَلِیْنَ۔ (حم سجدہ ۴) روندڈالیں تاکہ وہ دونوں خوب ذلیل ہوں"

(۲) فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ "پھر اُس دن اُس کے گناہ کی پُرسش نہیں
اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ (رحمن ۲) نہ انسان سے نہ جنّ سے"

اللہ تعالےٰ نے بعض جگہ مخاطبت بھی دونوں سے فرمائی ہے :۔

(۱) وَ یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا، "اور جب ہم سب کو اکٹھا کریں گے تو
یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ پوچھیں گے کہ اے گروہ جنّ! تم نے
مِّنَ الْاِنْسِ۔ (انعام ۱۵) انسانوں میں بڑا حصّہ لیا"

(۲) یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ "اے گروہ جنّ وانس! کیا تمہارے پاس
یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَقُصُّوْنَ ہمارے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم ہی میں سے تھے؟
عَلَیْكُمْ اٰیٰتِیْ۔ (انعام ۱۶) اور کیا انھوں نے ہماری آیتیں تمہیں سُنائی تھیں؟"

(۳) یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ "اے گروہ جنّ وانس! کیا تمکو اتنی سکت
اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا ہے کہ تم آسمانوں اور زمین کے دائروں
مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے باہر نکل جاؤ؟ اگر ہے تو نکلو۔
فَانْفُذُوْا، لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا مگر تم ہرگز نہیں نکل سکتے، ہاں البتہ
بِسُلْطٰنٍ۔ (رحمن ۲) طاقت کے ذریعے"

تاآنکہ "قرآن" ختم ہوتا ہے توان ہی دونوں اہم مخلوق کے ذکر، اور جنّ وانس ہی کے لفظ پر :۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ "کہدو کہ میں نوعِ انسانی کے پروردگار
مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝ شاہنشاہ اور اُن کے اللہ کی پناہ

مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ ۙ۬ الۡخَنَّاسِ ۪ۙ مانگتا ہوں وسوسہ انداز شیطان کے
الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ۙ شر سے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے
مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ ٪ ڈالتا ہو جن و انس دونوں میں سے"

یہ ہے میرے نزدیک "قصۂ آدم" کا وہ پہلو جس کو اب تک چیستاں بنائے رکھا گیا ہے، میں نے قرآن کے مطالعہ سے یہی سمجھا ہے کسی "متن" کی "شرح" کے یقینی طور پر "صحیح" ہونے کا تو وہی "شارح" دعویٰ کر سکتا ہے جو "ماتن" کے برابر کا علم رکھتا ہو۔ اور یہاں اس کا تصور بھی کسی بندہ میں، قرآن و صاحبِ قرآن، کی نسبت سے نہیں کیا جا سکتا۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد)

(کیا لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟ کیا ان کے قلوب پر تالے لگ گئے ہیں؟)

"زبور" و "توراۃ"

(حضرت داؤدؑ و موسیٰؑ کی کتابوں سے متعلق)

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

اقبال

کہا جاتا ہے کہ قرآن میں چار پیغمبروں کی مخصوص کتابوں کا نام کی خصوصیت کے ساتھ ذکر آیا ہے، یعنی دعویٰ یہ ہے کہ قرآن بتاتا ہے کہ فلاں فلاں چار پیغمبروں کو فلاں فلاں نام کی مخصوص چار کتاب دی گئی تھی —— اس دعویٰ پر قرآن کی روشنی میں بحث کی گئی ہے کہ اب تک جو یہ کہا جاتا رہا ہے وہ سرے سے نادرست ہے۔

"زبور" و "توراۃ"

سارے مسلمان "وید" اور "گیتا" کے الہامی ہونے کے متعلق کہتے ہیں کہ "ہو سکتی ہے" یہ نہیں کہتے کہ "ہے"۔ وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ چونکہ "قرآن" میں "نام کی تخصیص" کے ساتھ اس کا ذکر نہیں ہے، اس لئے حتمی اور یقینی طور پر ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ الہامی کتابیں ضرور ہی ہیں۔ مگر حیرت یہ ہے کہ جو مسلمان وید اور گیتا کو اس لئے الہامی صحیفہ نہیں مانتے کہ قرآن میں نام کی تخصیص کے ساتھ اُن کا ذکر نہیں ہے، وہ مسلمان "قرآن" کے بارے میں یہ کس طرح دعویٰ کرتے ہیں کہ داؤد علیہ السلام پر جو مخصوص کتاب نازل ہوئی تھی اس کا مخصوص نام "زبور" بتاتا ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو مخصوص کتاب اُتری تھی اُس کا مخصوص نام "توراۃ" بتاتا ہے؟ پھر یہ عام مسلمانوں کا انداز نہیں بلکہ بڑے بڑے محققین و مورخین اور اکابرینِ اسلام بھی، ایسا ہی فرماتے ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی کا شمار، اکابر مصنفین و مؤلفین ہی میں نہیں بلکہ وہ بہت بڑے "محققِ قرآن" اور "مورخِ اسلام" کی حیثیت سے بھی مسلّم ہیں۔ اور اُن کی کتاب "سیرۃ النبی" بہت ہی "عظیم المرتبت سرمایۂ تحقیق" اور بلند پایہ "قرآنی انسائیکلو پیڈیا" سمجھی جاتی ہے، اِس کتاب کی چوتھی جلد میں اُنھوں نے بھی (بڑی تقطیع کے صفحہ ۴۶۸ اور

چھوٹی تقطیع کے صفحہ ۵۹۷ پر) فیصلہ کن انداز میں لکھا ہے :-

"نام کی تخصیص کے ساتھ، قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے "توراۃ" جس کو ایک جگہ "صحفِ موسیٰؑ" بھی کہا گیا ہے (اعلیٰ) اور حضرت داؤدؑ کی "زبور" اور حضرت عیسیٰؑ کی انجیل اور خود "قرآن"

جس حد تک کہ حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرتؐ کا تعلق ہے، بلاشبہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ پر جو مخصوص کتاب نازل ہوئی تھی، اُس کا مخصوص نام "انجیل" ہے :-

(۱) وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ (مائدہ ۷) "اور ہم نے ان کے بعد عیسیٰؑ ابن مریم کو اس طرح بھیجا کہ وہ اپنے سے پہلے کی توراۃ کی تصدیق کرتے تھے اور ہم نے اُن کو "انجیل" دی تھی۔"

(۲) وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ (حدید ۴) "اور اُن کے بعد ہم نے عیسیٰؑ ابن مریم کو بھیجا اور اس کو "انجیل" دیا۔"

"انجیل" اسم معرفہ ہے، حضرت عیسیٰؑ کی "مخصوص کتاب" کا "مخصوص نام" ہے، اسی لئے "انجیل" کی جمع قرآن میں کہیں پر نہیں آتی ہے، اسی طرح "قرآن" یہ بھی بتاتا ہے کہ آنحضرتؐ پر جو "مخصوص کتاب" اُتری تھی اُس کا "مخصوص نام قرآن" ہے۔

(۱) وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي "اور بلاشبہ ہم نے تم کو سبع مثانی دسات

وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ (حجر ۶) آیتیں جو بار بار دُہرائی جاتی ہیں) اور قرآن عظیم دیا ہے ۔"

(۲) وَاَوْحَیْنَا اِلَیْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ " اور ہم نے تم پر جو وحی کیا ہے وہ یہی قرآن ہے ۔" (یوسف ۱)

" قرآن " بھی اسم معرفہ ہے ، آنحضرت کو ملی ہوئی " مخصوص کتاب " کا مخصوص نام ہے ، اسی لئے قرآن کی بھی جمع کہیں پر نہیں آئی ہے ، مگر یہ خیال قطعاً صحیح نہیں ہے کہ " قرآن " میں ، حضرت داؤدؑ پر نازل شدہ " مخصوص کتاب " کا مخصوص نام " زبور " اور حضرت موسیٰؑ پر اتری ہوئی " مخصوص کتاب " کا مخصوص نام " توراۃ " بیان کیا گیا ہے ۔ " قرآن " میں یہ کہیں پر بھی ، بیان نہیں کیا گیا ہے کہ حضرت داؤدؑ پر جو مخصوص کتاب " اتری تھی اس کا " انجیل " اور " قرآن " کیطرح مخصوص نام " زبور " ہے ۔ یا حضرت موسیٰؑ پر جو " مخصوص کتاب " نازل ہوئی تھی اس کا مخصوص نام " توراۃ " ہے ۔ لہذا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ " نام کی تخصیص " کے ساتھ " قرآن " میں چار کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے ۔

یہود و نصاریٰ " قرآن " کے سوا تمام صحائفِ آسمانی کو " بائبل " (BIBLE) کہتے ہیں ۔ " بائبل " دو حصوں میں منقسم ہے ، ایک " عہد عتیق " کہلاتا ہے یعنی (OLD TESTAMENT) جس کے معنی " پرانے عہد نامے " کے ہیں ، اس حصہ میں وہ کتابیں داخل ہیں جو حضرت عیسیٰؑ سے پہلے انبیاء بنی اسرائیل پر نازل ہوئی تھیں ، دوسرا حصہ " عہد جدید " کہلاتا ہے یعنی NEW TESTAMENT

جس کے معنی "نئے عہد نامے" کے ہیں، اِس حصّے میں وہ کتابیں بھی ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کے حواریین نے "انجیل" کہہ کے مرتّب کی ہیں اور وہ بھی ہیں جو دوسروں نے ضمناً اس سلسلے میں لکھی ہیں۔

"نئے عہد نامے" سے کوئی بحث نہیں اس لئے کہ جب "قرآن" نے واضح طور پر اور بہ اصرار و تکرار بتا دیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو ایک "مخصوص کتاب" ملی تھی۔ جس کا مخصوص نام "انجیل" ہے تو پھر اس سے آگے گفتگو کی ضرورت ہی نہیں۔ رہے "پرانے عہد نامے" سو "عہد عتیق" کو عیسائی عُلماء تین حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں اور اُن کی تعداد "۳۹" قرار دیتے ہیں۔ اور اُن میں سے اوّل کو "قانون" بتاتے ہیں، جس میں حضرت موسیٰؑ کی پانچ کتابیں ہیں۔ برخلاف ان کے یہودی علماء "عہد عتیق" کو چار حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں اور ان کی تعداد "۲۴" قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ بھی اوّل پانچ کتابوں کو "قانون" قرار دیتے ہیں جو حضرت موسیٰؑ کی ہیں، اس طور پر "عہد عتیق" یعنی OLD TESTAMENT میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤد علیہم السلام دونوں کی کتابیں داخل و شامل ہیں۔ قرآن نے اپنے نزول کے وقت صرف اپنے سے پہلی کتاب "انجیل" کا ذکر تو "نام کی تخصیص" کے ساتھ کیا، کیونکہ وہی جدید ترین الہامی و آسمانی کتاب تھی۔ باقی کتابوں کا جو "انجیل" سے پہلے کی تھیں "نام کی تخصیص" کے ساتھ کہیں پر بھی ذکر نہیں کیا، اور نہ ان کی کوئی تفصیل بیان کی صرف کہہ دیا کہ ہر قوم میں "رسُول" آتے ہیں۔ (یونس ۵ نحل ۵، روم ۵، رعد ۱، فاطر ۳) جن میں سے بعض کا ذکر کیا گیا ہے، اور

کچھ کا نہیں (مومن ۸) اور ہر نبی " کے ساتھ ایک کتاب " ضرور نازل کی گئی ہے ، (بقرہ ۲۶ ، آل عمران ۹ ، حدید ۳) لہذا مسلمانوں کے لئے تمام پیغمبروں اور اُن پر نازل شدہ کتابوں پر اجمالاً ایمان لانا اور رکھنا ضروری ہے (بقرہ ۱۶ ، نساء ۲۰) اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ۔ مسلمانوں کو اس سے کچھ بحث نہیں ہے کہ تمام کتابیں اِس وقت بھی علے حالہٖ موجود ہیں یا نہیں ؟ یا جو موجود ہیں وہ اصلی شکل میں کلیتاً محفوظ ہیں یا نہیں ؟ کیونکہ وہ ہمارا " دستور العمل " اور قانونِ زندگی نہیں ہیں ۔ خدا جانے یہ کب سے سمجھا جانے لگا کہ قرآن " میں نام کی تخصیص کے ساتھ " چار کتابوں کا ذکر آیا ہے ، اور قرآن نے بتایا ہے کہ حضرت داؤد کی مخصوص کتاب کا مخصوص نام " زبور " اور حضرت موسیٰ کی مخصوص کتاب کا مخصوص نام " توراۃ " ہے ۔

حضرت داؤد علیہ السلام پر جو مخصوص کتاب نازل ہوئی تھی اُس کا مخصوص نام " زبور " نہیں تھا ، البتہ چونکہ وہ کتاب بنی اسرائیل میں " زبور " کے نام سے مشہور تھی ، اس وجہ سے جب قرآن اس کا ذکر کرنے لگا تو اُس نے بھی " زبور " ہی کے نام سے اُس کو یاد کیا ، یعنی محض کتاب ۔ " زبور " کے معنی صرف " کتاب " کے ہیں ۔ " زبور " کوئی " مخصوص نام " نہیں ہے ، مسلمان اسکو " اسم معرفہ " سمجھتے ہیں ، حالانکہ " زبور " اسم نکرہ ہے ، قرآن میں دو جگہ آیا ہے :-

وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (نساء ۲۳ ، بنی اسرائیل ۶) " اور ہم نے داؤد کو زبور دیا تھا ۔ "

" زَبُور " اسم معرفہ یعنی " مخصوص نام " نہیں ہے بلکہ " اسم نکرہ " ہے ۔ یعنی محض کتاب "، مطلب صرف یہ ہے کہ ہم نے داؤدؑ کو بھی ایک " کتاب " دیا تھا ۔ اب چاہے اُس کا کوئی مخصوص نام ہو یا نہ ہو ۔ "قرآن" اور "انجیل" اسم معرفہ ہے اور " اسم معرفہ " کی جمع نہیں آتی ۔ اسی لئے " قرآن " اور " انجیل " کی، کہیں پر بھی، قرآن میں جمع نہیں آئی ہے ۔ اگر حضرت داؤدؑ کی کتاب کا بھی مخصوص نام " زَبُور " ہوتا اور " زَبُور " جیسا کہ سمجھا جاتا ہے " اسم معرفہ " ہوتا تو قرآن میں " زَبُور " کی " جمع " ہرگز نہ آتی ۔ مگر واقعہ یوں ہے کہ قرآن میں متعدد جگہ " زَبُور " کی جمع " زُبُر " آئی ہے :۔

(۱) اِنَّہٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ۔ " اور یہ وہی کچھ ہے جو پہلی زَبُوروں (کتابوں) میں بھی تھا ۔ "
(شعراء ۱۱)

چنانچہ خود علامہ سید سلیمان ندوی نے اسی مقام پر اس آیت کو پیش کر کے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ " اور بے شبہ پہلوں کی کتابوں میں مذکور ہے " پھر حیرت ہے کہ علامہ ندوی موصوف نے " زَبُور " کو " اسم معرفہ " کیسے سمجھ لیا ۔ ؟ آپ خود بھی سوچئے کہ اگر " قرآن " و " انجیل " کی طرح " زَبُور " بھی " اسم معرفہ " اور " مخصوص نام " ہوتا تو اس کی جمع " زُبُر " کیسے آتی ؟ اور بھی مقامات پر " زُبُر " آیا ہے :۔

(۲) وَالزُّبُرِ وَالْکِتٰبِ الْمُنِیْرِ " اور صحیفے اور روشن کتابیں "
(آل عمران ۱۹)

(۳) بِالْبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ (نحل ۶) " معجزے اور کتابوں کے ساتھ "

(۴) فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۔ (مومنون ۴) "سو ان لوگوں نے اپنی اپنی کتابوں سے احکام الگ الگ کر لیے ۔"

(۵) جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ ۔ (فاطر ۳) "ان کے پاس بھی ان کے پیغمبر معجزے اور کتابوں کے ساتھ آئے ۔"

(۶) اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِى الزُّبُرِ[1] (قمر ۳) "یا تمہارے لیے، کتابوں میں کوئی معافی ہے ؟ ۔"

جس طرح "زبور" کی جمع "زبر" آئی ہے "انجیل" اور "قرآن" کی جمع قرآن میں کہیں نہیں آئی ہے ۔ متذکرہ بالا آیتوں میں "زبور" کی جمع "زبر" آئی ہے ۔ یعنی "کتابیں"۔ اگر "زبور" حضرت داؤدؑ کی "مخصوص کتاب" کا "مخصوص نام" ہوتا تو اس کی جمع کیسے آئی ؟ لہذا "واٰتینا داؤد زبورًا" کے معنی ہیں کہ "ہم نے داؤدؑ کو بھی ایک کتاب دی تھی" اب اس کتاب کا کیا نام تھا ؟ قرآن نے نہیں بتایا، صرف "کتاب" کہہ کر چھوڑ دیا ہے، اس لیے "زبور" مخصوص نام نہیں ہے، ایک اور آیت یہ ہے جس سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے :-

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِى الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوْنَ (انبیاء ۷) "اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھدیا ہے کہ زمین کی وراثت میرے ان بندوں کو ملے گی جو صاحب صلاحیت ہوں گے ۔"

اگر یہاں "زبور" سے مراد، صرف حضرت داؤدؑ کی "مخصوص کتاب" لے لیا جائے تو پوری آیت مہمل ہو جائے گی، کیونکہ موجودہ "زبور" میں ایسا واضح اندراج

---

[1] آٹھ آیتوں کے بعد پھر لفظ "زبر" آیا ہے ۔

کہیں پر بھی نہیں ہے، دوسرے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت داؤدؑ کی کتاب کے علاوہ دوسری الہامی کتابوں میں ایسا نہیں لکھا گیا ہے کہ زمین کی وراثت صرف صاحبِ صلاحیت لوگوں کو ملے گی حالانکہ مفہوم یہ ہے کہ تمام الہامی کتابوں میں یہی مذکور ہے کہ "زمین" کے مالک وہی ہوا کریں گے جو اس کی اہلیت و صلاحیت رکھیں گے، حضرت ابراہیمؑ کو پہلے ہی کہدیا گیا تھا:۔

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِينَ "میرا یہ وعدہ اُن کے لئے نہیں ہے جو ظالمین میں سے ہوں گے ۔" (بقرہ ۱۵)

دراصل یہاں بھی "زبور" سے مراد محض "کتاب" ہے اور اس میں ایک کلیۃً "قاعدہ" بیان کیا گیا ہے، اور اس لفظ کو یہاں بطور جمع استعمال کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا یہی قانون میری تمام کتابوں میں لکھا ملے گا، کہ وراثتِ ارضی صاحبِ صلاحیت لوگوں کے لئے مخصوص ہوگی۔ لہذا یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو جو "مخصوص کتاب" ملی تھی اُس کا مخصوص نام "زبور" ہے "زبور" کے معنی صرف "کتاب" کے ہیں۔ اور یہ "اسم نکرہ" ہے، مطلب صرف یہ ہے کہ حضرت داؤدؑ کو بھی ایک کتاب دی گئی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں بھی یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ قرآن" اُن پر نازل شدہ "مخصوص کتاب" کا "مخصوص نام" "توراۃ" بتاتا ہے۔ قرآن میں یہ کسی جگہ پر بھی نہیں آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ پر "توراۃ" نازل ہوئی تھی یا یہ کہ حضرت موسیٰ پر جو کتاب نازل ہوئی تھی جس کو غلطی سے توریۃ کہا جاتا ہے،

اُس کا مخصوص نام " توراۃ " ہے، یہود و نصاریٰ قائل ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کی پانچ کتابیں ہیں :-

(۱) کتاب پیدائش (۲) کتاب خروج (۳) کتاب احبار،

(۴) کتاب اعداد (۵) کتاب استثناء۔

اور مسلمان کہتے ہیں کہ اُن پر ایک کتاب نازل ہوئی تھی۔ جس کا نام " توراۃ " ہے، یہ بات چنداں قابلِ خیال نہیں ہے کہ وہ کتاب جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی ایک ہے، یا پانچ ؟ کسی ایک کتاب کے اگر پانچ حصے ہوں تو وہ پانچ کتاب بھی کہلا سکتی ہے اور ایک بھی کہلا سکتی ہے جس کے پانچ ابواب ہوں۔ البتہ یہ صحیح نہیں ہے کہ حضرت موسیٰؑ پر جو کتاب نازل ہوئی تھی، قرآن نے اس کا " مخصوص نام " " توراۃ " بتایا ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ کا تنہا یا بہ شمول حضرت ہارونؑ، قرآن میں بہت جگہ ذکر آیا ہے۔ مگر کسی ایک مقام پر بھی اُن کی کتاب کا نام " توراۃ " نہیں بتایا گیا ہے، کہیں پر اُس کو " آیات " کہا گیا ہے۔ (اعراف ۱۳، یونس ۸، مومنون ۳) اور کہیں پر " فرقان[1] " (انبیاء ۴) اور زیادہ تر " کتاب "

---

[1] " فرقان " کوئی مخصوص نام نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اصلی معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی حق و باطل کو الگ الگ کر دینے والی امتیازی چیز۔ اسی لئے " قرآن " کے لئے بھی " فرقان " آیا ہے، " کتاب موسیٰ " کے لئے بھی اور " مسلمانوں " کے لئے بھی :-
تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ، " بہت عالی قدر ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کی۔ " (فرقان ۱)

(باقی بر صفحہ ۱۴۵)

(بقرہ ۱۰، انعام ۱۱ و ۱۹، ہود ۱۰، بنی اسرائیل ۱، مومنون ۳، فرقان ۴، قصص ۵، سجدہ ۳، والصّٰفّٰت ۴، مومن ۶، حم سجدہ ۶، احقاف ۲، وغیرہ) اور کہیں "صحفِ موسیٰؑ" (نجم ۳، اعلیٰ ۱) مگر کسی ایک جگہ بھی اُن پر جو مخصوص کتاب نازل ہوئی ہے، اس کا مخصوص نام "ہرگز" "توراۃ" نہیں بتایا گیا ہے۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ "توراۃ" کوئی دوسری چیز ہے اور حضرت موسیٰؑ کی کتاب کا کوئی مخصوص نام نہیں۔ ورنہ یہ کس درجہ عجیب بات ہے کہ "توراۃ" کا لفظ بھی قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے اور حضرت موسیٰؑ کا ذکر بھی پچیسیوں[۲۵] جگہ ہے، مگر کسی ایک جگہ بھی، کسی موقع پر بھی، کسی سلسلے میں بھی، اُس کو حضرت "موسیٰؑ کی کتاب" کہہ کر پیش نہیں کیا گیا ہے۔ "انجیل" کو حضرت عیسیٰؑ سے منسوب کیا گیا ہے اگر حضرت موسیٰؑ کی کتاب کا مخصوص نام "توراۃ" تھا تو کسی جگہ بھی اُس کو اُن سے کیوں منسوب نہیں کیا گیا۔؟ لہٰذا یہ سمجھنا اور کہنا صحیح نہیں ہے کہ قرآن میں حضرت موسیٰؑ پر نازل شدہ کتاب کا مخصوص نام "توراۃ" ظاہر کیا

(صفحہ ۱۴۴ کا باقی حاشیہ)

اور حضرت موسیٰؑ کی کتاب کو بھی "فرقان" کہا گیا ہے:۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ (انبیاء ۴) "اور ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو فرقان عطا فرمائی"

اور "مسلمانوں" کو بھی "فرقان" کہا گیا ہے:۔

اَنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا ۔ "اگر تم متقی بن گئے تو اللہ تمہارے لئے تمام دنیا میں ایک خاص امتیاز اور خصوصیت پیدا کر دیگا۔" (انفال ۴)

"قیامت کے دن" کو بھی "فرقان" کہا گیا ہے "يَوْمَ الْفُرْقَانِ" (انفال ۵)

گیا ہے ۔ قرآن نے بیسیوں جگہ یہ ضرور بتایا ہے کہ حضرت موسیٰؑ پر " کتاب " نازل ہوئی تھی مگر یہ کہیں پر بھی کسی ایک مقام پر بھی نہیں بتایا ہے ، کہ اُس کا مخصوص نام " توراۃ " ہے ، لہذا :-

(۱) یہ صحیح ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرتؐ پر جو کتاب نازل ہوئی تھی ، قرآن نے اُس کا مخصوص نام " انجیل " اور " قرآن " بتایا ہے ——— مگر

(۲) یہ صحیح نہیں ہے کہ قرآن نے حضرت داؤدؑ اور حضرت موسیٰ علیہم السلام پر نازل شدہ کتاب کا " مخصوص نام " " زبور " اور " توراۃ " بتایا ہے ، قرآن نے صرف یہ بتایا ہے کہ اُن پیغمبروں کو بھی " کتاب " ملی تھی ، مگر یہ کہیں نہیں بتایا ہے کہ اُن کا کوئی مخصوص نام بھی تھا اور تھا تو کیا تھا ؟ " زبور " کے معنی محض " کتاب " کے ہیں اور " توراۃ " دوسری چیز ہے ۔

وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ " مومنوں سے سچا وعدہ کیا گیا ہے توراۃ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ (توبہ ۱۴) میں اور انجیل میں اور قرآن میں ۔"

غور فرمائیے ۔ " قرآن " کے نزول کے وقت ، جو تازہ ترین اور جدید الورود کتاب تھی وہ " انجیل " تھی ، اس سے پہلے کی جو کتابیں تھیں وہ بہت پرانی ہو چکی تھیں ۔ قرآن ، جابجا قدیم وجدید " تاریخ " کی طرف بھی اشارہ کرتا تھا ، جس وجہ سے یہ ضرور تھا کہ سابقہ پیغمبروں کے ذکر میں ضرورتاً اُن کی کتابوں کا بھی حوالہ آتے ۔ اور اگر ہر پیغمبر کی کتاب کا " قرآن " ذکر کرتا تو اُس کا حُسنِ اختصار

و ایجاز ختم ہو جاتا، لہٰذا قرآن نے الہامی صحائف کے ذکر کا انداز یہ اختیار کیا کہ اُن کو تین[۳] حصوں میں بانٹ دیا، جیسا کہ اُوپر کی آیت سے ظاہر ہے، یعنی:۔

اوّل ۔ "قرآن" جو نازل ہو رہا تھا۔

دُوم ۔ "انجیل" جو آنحضرتؐ سے صرف پانچ سو برس پہلے، حضرت عیسیٰؑ پہ نازل ہوئی تھی اور عرب یا دنیا کے لوگ اس سے روشناس و متعارف تھے۔

سوم ۔ "انجیل" سے پہلے کی وہ کتابیں جو اُس وقت بھی "بائبل" کے نام سے یکجا تھیں اور آج بھی اکٹھی مجلد ہیں۔

اسی آخری تقسیم کو "توراۃ" کے ایک جامع لفظ سے قرآن نے یاد کیا ہے۔ گویا آج کل جس مجموعۂ کتاب کو "عہدِ عتیق" یا "پُرانے عہد نامے" یا OLD TESTAMENT کہا جاتا ہے، اُسی کو قرآن نے "توراۃ" کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ اس میں حضرت داؤدؑ اور حضرت موسیٰؑ کی بھی کتابیں شامل ہیں۔ اگر اس تفسیر کو تسلیم نہ کیا جائے تو متذکرہ بالا آیت بالکل لغو ہو جاتی ہے کیونکہ اللہ کے وعدے کیا صرف اِنہی تین کتابوں میں ہیں، جو موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور محمدؐ علیہم السلام پر نازل ہوئیں؟ اور وہ جو دوسرے پیغمبر کتابیں لائے؟ اس لئے بلاشبہ "توراۃ" سے مراد انجیل سے پہلے کی آسمانی کتابوں کا مجموعہ ہے۔ صاحبِ "نوید جاوید" لکھتے ہیں:۔

"توراۃ سے مراد ... سب کُتب عہدِ عتیق ہے یعنی انجیل سے پیشتر جتنی کتابیں نازل ہوئیں۔"

سینڈرز لینڈ لکھتا ہے :۔

"یہ خیال محض ایک روایت ہے کہ "توراۃ" کے مصنف موسیٰ تھے، اور یہ روایت بھی بہت بعد کی ہے خود "توراۃ" میں اسکا کہیں پر ذکر نہیں ہے، کہ موسیٰؑ اس کے مصنف تھے، نیز اس مجموعۂ کتب میں بہت سے مصنفین کی تصنیفیں ہیں جن میں سے بعض بہت بعد کی ہیں۔"

قرآن میں جہاں کہیں بھی لفظ "توراۃ" آیا ہے اس پر غور وفکر کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے، کہ دراصل "انجیل" سے قبل کی اُن الہامی کتابوں کے مجموعے کو "توراۃ" کہا گیا ہے، جو "بائبل" میں موجود ہیں، مثلاً :۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ "اللہ تعالیٰ نے تم پر سچائی کیساتھ کتاب مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ نازل کی ہے جو تصدیق کرتی ہے اُن تمام التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ کتابوں کی جو اس سے پہلے ہوئی ہیں اور قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ اور اس سے پہلے ہم نے لوگوں کی ہدایت کیلئے الْفُرْقَانَ (آل عمران ۱) "توراۃ" اور "انجیل" نازل کی تھیں۔"

اب اس سے کیا سمجھا جائیگا؟ اگر "توراۃ" حضرت موسیٰؑ کی مخصوص کتاب کا "مخصوص نام" ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن، اپنے سے پہلے کی کتابوں میں صرف حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر نازل شدہ کتابوں کی تو تصدیق کرتا ہے، باقی دوسرے پیغمبروں کی کتابوں کی نہیں؟ نیز لوگوں کی "ہدایت" کے لئے جو کتابیں نازل ہوئی تھیں وہ دراصل دو ہی ہیں حضرت موسیٰ کی کتاب "توراۃ"

اور حضرت عیسیٰؑ کی کتاب " انجیل " باقی کتابیں " ہدایت " کے فیض سے محروم ہیں ۔ لہٰذا لامحالہ یہ واضح ہوتا ہے ۔ کہ " انجیل " کا ذکر اس لئے کیا گیا۔ کہ وہ جدید ترین کتاب تھی اور اس سے پہلے کی تمام قدیم کتابوں کو ۔ " توراۃ " کہا گیا ہے ، ایک جگہ ہے :۔

یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ لِمَ تُحَاجُّوْنَ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِیْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ " اے کتاب والو! کیوں حجت کرتے ہو، ابراہیم کے بارے میں، حالانکہ توراۃ و انجیل کا نزول تو ان کے بعد ہوا ہے ۔ " (آلِ عمران ۷)

" قرآن " میں نام کی تخصیص " کے ساتھ جن پیغمبروں کا ذکر ہوا ہے وہ سب " مشرقِ وسطیٰ " سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اور وہ سب " سامی النسل " شاخِ ابراہیمی سے ہیں ۔ جن سے اہلِ عرب قربت و قرابت بھی رکھتے تھے ، اور واقف و متعارف بھی تھے ۔ اِس شاخ میں سب سے پہلے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوئے ہیں ۔ مگر اُن کا صحیفہ لاپتہ ہے ۔ اور " توراۃ " میں یعنی موجودہ " بائبل " میں حضرت ابراہیم کا صحیفہ نہیں ہے ۔ بنی اسرائیل کے پاس یہی مجموعہ رہ گیا ہے ، جس کو قرآن نے " توراۃ " کے لفظ سے یاد کیا ہے ۔ لہٰذا اِس آیت میں انھیں بتایا گیا کہ " توراۃ " و انجیل " یعنی جو مجموعہ صحائف تمہارے پاس اِس وقت موجود ہیں ، وہ تو سب کے سب وہ ہیں جو حضرتِ ابراہیم کے بعد کے پیغمبروں پر نازل شدہ ہیں پھر تم لوگ اِن صحائف کو سامنے رکھ کر ابراہیم کے بارے میں کیا بحث و جدال اور حجت کرتے ہو ، ؟ ۔ اب اگر

" توراۃ " کو حضرت موسیٰؑ پر نازل شدہ " مخصوص کتاب " کا مخصوص نام سمجھا جائے تو حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہم السلام اور پھر اُن کے درمیان والے اُن تمام سامی النسل پیغمبروں کے صحائف کیا ہوئے جن کا قرآن ذکر کر کے ہمیں اُن پر ایمان لانے کو کہتا ہے ؟ ۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مخاطبین سے فرمایا تھا کہ :۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ ۔ " میں تصدیق کرتا ہوں توراۃ کی جو مجھ سے پہلے ہے ۔"

یہ آیت ، سورۂ آلِ عمران کے پانچویں رکوع میں ایک بار، سورۂ مائدہ کے ساتویں رکوع میں دو بار اور سورۂ الصّف کے پہلے رکوع میں ایک بار آئی ہے ۔ پھر کیا " انجیل " سے پہلے صرف حضرت موسیٰ ہی پر ایک کتاب توریٰۃ نازل ہوئی تھی کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے سے پہلی کتابوں میں صرف حضرت موسیٰؑ کی کتاب کی تصدیق کا ذکر کیا ؟ کیا حضرت موسیٰؑ کے علاوہ جن دوسرے انبیاء بنی اسرائیل پر کتابیں اتری تھیں، اُن کی تصدیق حضرت عیسیٰؑ کے ذمے نہ تھی ؟ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے سے پہلے کی تمام کتابوں کی تصدیق کرتے تھے اسی لئے اُنھوں نے صرف " توریٰۃ " کی تصدیق کی جو اُن سے پہلے کی تمام الہامی کتابوں کا مجموعہ ہے ۔ ایک جگہ ہے :۔

إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ " ہم نے توریٰۃ نازل کی تھی جس میں ہدایت تھی اور نور تھا، انبیاء جو کہ

اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا ۔ مطیع تھے، اسی کے مطابق یہود کو حکم دیا کرتے تھے ۔ (مائدہ ۷)

اگر "توراۃ" نام ہے حضرت موسیٰؑ کی " مخصوص کتاب " کا تو یہودیوں کے پاس جو دوسرے پیغمبروں کی کتابیں تھیں اُن کا ذکر کیوں چھوڑ دیا گیا ؟ وہ کتابیں بھی یہودیوں کے پاس موجود تھیں پھر یہ بات چھپائی کیوں گئی اور یہ کیسے کہہ دیا گیا کہ اُن کے پاس " توراۃ " ہے، جب کہ موجودہ بائبل میں کسی ایک کتاب کا بھی نام " توراۃ " نہیں ہے ؟ ۔

اللہ تعالےٰ نے صرف حضرت موسیٰؑ کی کتاب کا کیوں ذکر کیا جبکہ بنی اسرائیل پر اُس سے پہلے کی اور بھی کتابیں اسی اللہ کی نازل کی ہوئی تھیں ؟ اور کیا " ہدایت " اور " نور " صرف حضرت موسیٰ کی کتاب میں ہی تھا ۔ اور دوسرے الہامی صحائف اِن محاسن سے خالی تھے ؟ ۔ اور دیگر انبیاء بنی اسرائیل پر نازل شدہ کتابوں میں نہ "ہدایت" تھی نہ "نور" تھا ۔ ؟ اگر " توراۃ " نام ہے صرف حضرت موسیٰؑ کی مخصوص کتاب کا تو یہ کہنا کیا معنی کہ انبیاء کرام توراۃ کے مطابق یہود کی رہنمائی فرمایا کرتے تھے ؟ حضرت موسیٰؑ سے پہلے کے پیغمبر حضرت موسیٰؑ کی " توراۃ " کے مطابق کس طرح یہود کو حکم دے سکتے تھے ؟ لہٰذا بلاشک وریب یہ ماننا پڑے گا کہ " توراۃ " حضرت موسیٰؑ کی مخصوص کتاب کا نام نہیں ہے ۔ بالخصوص اس لئے بھی کہ بائبل میں نہ تو حضرت موسیٰؑ کی کسی کتاب کا نام " توراۃ " مذکور ہے اور نہ کسی اور پیغمبر کی بھی کسی کتاب کا نام " توراۃ " بتایا گیا ہے، لفظ توراۃ صرف

قرآن کا ایجاد ہے ۔ اور اِس سے مراد وہ " تمام صحائف " ہیں جو حضرت عیسیٰؑ سے پہلے انبیاء بنی اسرائیل پر نازل ہوئے تھے اور موجودہ " بائبل " میں موجود ہیں ۔ آنحضرت کے عہد میں سامی النسل قومیں تین حصوں میں بٹی ہوئی تھیں، ایک حصہ " مشرکین " کا تھا، دوسرا " یہودیوں " کا تیسرا " عیسائیوں " کا ۔ یہود و نصاریٰ اہلِ کتاب کہلاتے تھے، اِن دونوں کے لئے قوانین الٰہی الگ الگ تھے، یہودیوں کے یہاں " توریٰۃ " رہنما تھی :۔

کَیْفَ یُحَکِّمُوْنَکَ وَعِنْدَھُمُ التَّوْرٰىۃُ فِیْھَا حُکْمُ اللّٰہِ ۔ (مائدہ ۶)

" وہ تم سے کس طرح فیصلے کراتے ہیں؟ اُن کے پاس تو توریٰۃ ہے ہی، جس میں اللہ کا حکم موجود ہے ۔ "

اور عیسائیوں کے لئے " انجیل " مشعلِ راہ تھی :۔

وَلْیَحْکُمْ اَھْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فِیْہِ ۔ (مائدہ ۷)

" اور انجیل والوں کو چاہیے کہ اللہ نے جو کچھ اسمیں نازل کیا ہے اسکے مطابق فیصلے کیا کریں "

جس " توریٰۃ " کا ذکر قرآن کرتا ہے کہ وہ اُن کے پاس ہے، وہ انبیاء بنی اسرائیل کے موجود صحائف کا مجموعہ ہے جو بائبل کہلاتا ہے اور جسمیں، حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ علیہم السلام کی بھی کتابیں ہیں، نہ حضرت موسیٰؑ کی کتاب کہیں علیحدہ ہے، اور نہ اُس کا مخصوص نام " توریٰۃ " ہے، پھر اگر " توریٰۃ " صرف حضرت موسیٰؑ کی کتاب مان لی جائے تو یہود کے لئے ان کے باقی پیغمبروں کی کتابیں محض بے معنی اور فضول ہو کر رہ جاتی ہیں ۔ " اہلِ کتاب " کے متعلق پھر وضاحت کی گئی ہے کہ :۔

(۱) وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰۃَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَکَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۔ (مائدہ ۹)

" اور اگر یہ لوگ توراۃ، انجیل اور اُس کتاب کی جو اُن کے پروردگار کی طرف سے اُن کے پاس بھیجی گئی ہے (یعنی قرآن) پوری پابندی کرتے تو یہ لوگ بڑی فراغت سے کھاتے پیتے ہوتے ۔"

(۲) قُلْ یٰۤاَهْلَ الْکِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰۃَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ (مائدہ ۱۰)

" کہدو کہ اے اہلِ کتاب! تم کسی بھی راہ پر نہیں ہو جب تک کہ توراۃ وانجیل کی اور اُس کتاب کی (یعنی قرآن) کی پیروی نہ کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس آئی ہے ۔"

ان دونوں آیتوں پر غور کیجئے، اگر " توراۃ " حضرت موسیٰؑ کی کتاب کا نام ہے تو پھر اور الہامی کتابیں، جو حضرت موسیٰؑ سے پہلے اور بعد کی ہیں، بے کار محض ہو جاتی ہیں حالانکہ یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی الہامی صحیفہ فضول ہو جائے، کیونکہ اگر وہ فضول ہے تو اُس کا نزول ہی کیوں ہوا ۔ ؟ لہذا یہ قطعی ہے کہ " انجیل " سے پہلے کی کتابوں کے اُس مجموعہ کو قرآن نے " توراۃ " کہا ہے جس کو اس وقت " بائبل " یا " عہدِ عتیق " یا " OLD TESTAMENT " کہا جاتا ہے ۔

حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے لئے دعاء کی تو مشروط جواب ملا۔ جن میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ یہ سب اسی صورت میں ممکن ہے کہ :۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ " وہ اس رسول کی پیروی کریں گے جو نبی

الاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَہٗ « نبی ہوگا اور اس کے ظہور کی خبر وہ اپنے
مَکْتُوْبًا عِنْدَھُمْ فِی التَّوْرٰۃِ یہاں توریٰۃ و انجیل میں لکھی ہوئی پائینگے تو البتہ
وَالْاِنْجِیْلِ (اعراف ۱۹) اُن کو فلاح ہو سکے گی ۔ «

اگر « توریٰۃ » کو صرف حضرت موسیٰؑ کی کتاب مان لیا جاتے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرتؐ سے متعلق، بجز حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ علیہم السّلام کی کتابوں کے، دوسرے الہامی صحائف میں کوئی بشارت موجود نہیں ہے۔ ورنہ صرف دُو ہی کتابوں کی تخصیص کیوں کی جاتی ؟ دراصل « توریٰۃ » سے مراد وہ سارے الہامی صحیفے ہیں جو « انجیل » سے قبل نازل ہوتے تھے، اور موجودہ « عہد عتیق » میں موجود ہیں۔ اور جیسا کہ میرے دوست شاہ محمد قائم رضوی داناپوری نے اپنی انگریزی کتاب « MOHAMMAD IN DIVINE BOOKS » میں ظاہر کیا ہے، عہد حاضر کے سارے موجود الہامی صحائف یعنی « عہد عتیق » اور « عہد جدید » میں، آنحضرتؐ کی بعثت و آمد کی بشارت کسی نہ کسی عنوان و بیان سے، موجود ہے۔

سامی النسل قوموں کی شامی شاخ میں سب سے پہلے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السّلام ہیں، اِن سے پہلے اِس شاخ میں نہ کوئی پیغمبر ہی ہوا نہ کوئی کتاب ہی آئی

سلہ « نبی اُمی » سے عام طور پر « ان پڑھ نبی » مراد لیا جاتا ہے یہ بالکل غلط ہے « ان پڑھ » ہونا کوئی صفت نہیں ہے کہ « معلم انسانیت » کی تعریف « ان پڑھ » کرکے کی جاتی۔ میں نے اپنی کتاب، « مآلِ بصیرت » میں اِس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے کہ « نبی اُمی » کے معنی « مکی نبی » کے ہیں

"بنی اسرائیل" وہ کہلاتے ہیں جو حضرت یعقوبؑ (حضرت ابراہیم کے پوتے) کی اولاد ہیں۔ اس لئے کہ "اسرائیل" ہی کو "یعقوب" کہا جاتا ہے۔ پھر جب کوئی قانون ہی نہ تھا تو "حلال وحرام" کا کیا سوال؟:-

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىٓ	"نزولِ توراۃ کے قبل بنی اسرائیل
اِسْرَآئِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ	پر سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں
اِسْرَآئِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ	سوائے اُس کے جس کو یعقوبؑ
قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ	نے خود اپنے سے اپنے پر حرام
(آل عمران ۱۰)	کر لیا تھا۔"

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ الہامی صحائف کے نزول سے قبل بنی اسرائیل پر کوئی چیز حرام نہ تھی یعنی اس کا کوئی سوال ہی نہ تھا، اور واقعی جب کوئی بھی قانون ہی نہ تھا، تو "حرام وحلال" کا کیا قانون جاری ہوتا اور کہاں سے؟[1]-

خدا سے ڈرنے والوں کی شناخت یہ بتائی گئی ہے:-

سِيْمَاهُمْ فِىْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ	"اُن کی پیشانیوں پر سجدوں کے
اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ	نشان ہوں گے اور اُن کی یہ
فِى التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِى الْاِنْجِيْلِ	نشانیاں توراۃ میں بھی مذکور ہیں
(فتح ۴)	اور انجیل میں بھی۔"

کیا مطلب؟ کیا حضرت موسیٰؑ سے پہلے اور بعد کی الہامی کتابیں با ایمان لوگونکی

---

[1] جب کتابوں کا نزول شروع ہوا اور انھوں نے اعتراض کیا تو بطور سزا بعض چیزیں اُن پر حرام کر دی گئیں (نساء ۲۲)

شناخت بتانے سے قاصر ہیں ؟ ۔ اگر نہیں تو حضرت موسیٰؑ سے پہلے اور بعد کی کتابوں کو نظر انداز کر دینا کیا معنی ؟ دراصل " توراۃ " سے مراد " انجیل " سے پہلے کی تمام موجود کتب بنی اسرائیل کا وہ مجموعہ ہے جو اس وقت " بائبل " کہلاتا ہے ، اور سب ہی میں یہ بتایا گیا ہے کہ مومن بندہ کی شناخت کیا ہے ؟ " بنی اسرائیل " وہ قوم ہے جو تمام نسلِ انسانی میں معزز و محترم بنائی گئی تھی :۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ " اے بنی اسرائیل ! یاد تو کرو اللہ کی الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ نعمتوں کو جو اُسنے تم پر کی تھیں اور اسکو فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ بھی کہ میں نے تم کو سارے لوگوں پر

(بقرہ ۲) فضیلت دی تھی ۔ "

اِن ہی نعمتوں میں ایک نعمت یہ بھی تھی کہ برابر اِس قوم میں پیغمبر مبعوث ہوتے گئے اور اِس طرح کہ :۔

(۱) ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ..... " پھر ہم نے پیغمبروں کو یکے بعد دیگرے فَاَتْبَعْنَا بَعْضَھُمْ بَعْضًا ۔ بھیجنا شروع کر دیا .... سو ہم نے

(مومنون ۳) ایک کے بعد ایک کا نمبر لگا دیا ۔ "

(۲) لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ " بلاشبہ ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ ۔ احکام دیکر بھیجا اور ہم نے اُن سب کے

(حدید ۳) ساتھ کتابیں بھی نازل کیں ۔ "

مگر یہ قوم بھی عجیب قوم تھی کہ پیغمبر پہ پیغمبر آتے تھے ، کتاب پر کتاب نازل ہوتی تھی

مگر اس قوم کے لوگ ذرا بھی نہیں سنبھلتے تھے، کوئی صلاح قبول نہ کرتے تھے ان کے لئے کہا گیا :-

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ " جن لوگوں کو توراۃ پر عمل کرنے ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ کا حکم دیا گیا تھا، ان کی حالت الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا۔ اُس گدھے کی سی ہے جس پر بہت سی کتابیں لدی ہوں -" (جمعہ ۱)

یہاں یہودیوں کے پاس " توراۃ " کے ہوتے ہوئے اُن کے بداعمال رہنے کی مثال دی گئی ہے کہ " چارپائے بروکتابے چند " یہ ضرب المثل بتاتی ہے کہ " توراۃ " سے مراد صرف ایک کتاب نہیں جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی بلکہ وہ تمام صحائف آسمانی ہیں جو " انجیل " سے پہلے وقتاً فوقتاً انبیاء بنی اسرائیل پر یہودیوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے نازل ہوئے تھے اور جن کی تعداد بقول یہودی علماء چوبیس ۲۴ سے کم نہیں ہے۔ اور جو موجودہ " بائبل " میں موجود ہیں۔ اگر اس قدر صحائف کے موجود ہوتے ہوئے بھی کوئی قوم گمراہ اور بدچلن ہی رہے تو واقعی سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے، کہ گدھے پر کتابیں لدی ہیں مگر وہ بے خبر ہے ؟ ۔ اگر " توراۃ " صرف حضرت موسیٰؑ کی ایک " مخصوص کتاب " ہوتی تو یہ " مَثَلَ " ہرگز نہ پیش کی جاتی ۔ کیا " ایک کتاب "، پڑھ کے جاہل و گمراہ رہ جانے والے پر یہ محاورہ چست ہو سکتا ہے ۔ ؟ نیز یہ بھی عجیب بات ہوتی کہ اللہ تعالےٰ یہودیوں کی گمراہی کا تو اس شدّ ومد سے تذکرہ کرے لیکن اُن کے پاس بھیجی ہوئی ساری کتابوں میں سے صرف " ایک پیغمبر " کی

" ایک مخصوص کتاب " کا تذکرہ کرے اور وہ بھی ایک چست نہ ہونے والے محاورے کے ساتھ ۔

غرض، قرآن مجید میں، جہاں پر بھی دیکھا جائے " تورٰۃ " کا لفظ، محض " صحائفِ موسیٰ " کے لئے نہیں آیا ہے ۔ اور نہ کسی جگہ " تورٰۃ " کو حضرت موسیٰؑ سے منسوب کر کے اُن کی کتاب ظاہر کیا گیا ہے، اور نہ خود موجودہ بائبل ہی میں کسی کتاب کا بھی نام " تورٰۃ " ہے ۔ بلکہ اس سے مُراد " انجیل " سے پہلے کی، اُن تمام کتابوں کا جو انبیاء بنی اسرائیل پر نازل ہوئی تھیں، وہ مجموعہ" ہے جس کو اِس وقت " عہد عتیق " کے نام اور " بائبل " کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اِس طور پر نتیجہ یہ نکلا کہ :۔

(۱) " انجیل " اور " قرآن " حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد علیہم السّلام کی "مخصوص کتابوں " کا " مخصوص نام" ہے جس کو قرآن نے بتایا ہے، اور اس طور پر " انجیل " اور " قرآن " اسم معرفہ ہے ۔

(۲) "زبور" حضرت داؤدؑ کی کتاب کا " مخصوص نام " نہیں ہے، یہ " اِسم نکرہ " ہے، زبور کے معنی محض کتاب کے ہیں، اسی لئے قرآن میں متعدد جگہ " زبور " کی جمع " زُبر " آئی ہے ۔

(۳) " تورٰۃ " بھی حضرت موسیٰؑ کی " مخصوص کتاب " کا " مخصوص نام " نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اُن تمام کتابوں کا وہ مجموعہ ہے جو " انجیل " سے پہلے بنی اسرائیل پر نازل ہوئی تھیں اور اِس وقت " بائبل " کے نام سے موجود ہے ...."

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۝

(نساء ۱۱)

کیا پھر لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے ؟ یہ اگر اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اسمیں کثرت سے اختلاف پایا جاتا

" مُحکَم " و " مُتَشَابِہ "

(قرآنی آیات کے ذکر میں)

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ " رازی " نہ " صاحبِ کشاف "

اقبال

قرآن نے ایک جگہ کہا کہ قرآن کی کچھ آیتیں مُحکَم ہیں اور
کچھ مُتَشابِہ ۔ مگر پھر ایک جگہ پورے قرآن ہی کو
مُحکَم کہہ دیا ، اور پھر ایک جگہ پورے قرآن ہی کو
مُتَشابِہ کہدیا ، اور پھر یہ بھی کہدیا کہ "مَاتَشَابَہَ" کی پیروی وہی
کرتے ہیں جن کے دلوں میں کجی ہے ۔ یہ کیا ہے ؟ ۔
زیر نظر مقالہ میں اسی عنوان پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔

مُحکمؔ و مُتشابہؔ

سورۃ " آلِ عمران " کی چھٹی آیت میں، اللہ تعالےٰ نے اپنے نازل کئے ہوئے " قرآن " کی تعریف یہ کی ہے کہ اس کی آیتیں " مُحکَم " بھی ہیں اور " مُتَشَابہ " بھی، مگر آج تک یہ مسئلہ لاینحل ہے اور اب تک یہ متعین نہ ہوسکا ہو کہ " محکم " سے واقعی کیا مراد ہے؟ اور " متشابہ " کا صحیح معنی میں مطلب کیا ہے؟ ـــــــــــ ساڑھے تیرہ سو برس کا یہ مشکل مسئلہ، ہر مفسر اور قرآن خواں کے سامنے آیا مگر اب تک کوئی ایسی تعریف " مُحکَم اور مُتَشَابہ " کی متعین نہ ہو سکی یا نہ کی جا سکی ہے، جسے دل قبول کر لے یا وہ کسی طرح بھی چسپت ہو جاتی ہو۔ آیاتِ زیرِ بحث یہ ہیں:ـــ

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ " وہ اللہ ایسا ہی جس نے تم پر ایک کتاب نازل
مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ کی ہے، جس میں محکم آیات ہیں ـــ
اُمُّ الْکِتٰبِ اور یہی اُمّ الکتاب ہیں ۔
وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ اور دوسری متشابہ ہیں ۔
فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ سو جن کے دلوں میں کجی ہے ۔
فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ وہ تو ان ہی کا اتباع کرتے ہیں جو قرآن سے

اِبْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ	متشابہ ہیں، فتنہ پردازی کے لئے
تَأْوِيْلِهٖ ۔	اور نتیجہ کی جستجو کے لئے ۔
وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ	اور نتیجہ کی جستجو فضول ہی اسے بجز اللہ کے
وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ	کوئی نہیں جانتا اور جو مستحکم علم و یقین رکھنے
يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ	والے ہیں وہ تو یہی کہتے ہیں کہ ہم اُن پر بھی ایمان
عِنْدِ رَبِّنَا ۔	رکھتے ہیں کیونکہ وہ سب ہی اللہ ہی کیطرف سے ہیں،
وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝	اور نصیحت تو صرف عقلمند ہی قبول کرتے ہیں "

اِن آیات میں کہا یہ گیا ہے کہ :۔

(۱) خدا نے ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جس کی کچھ آیتیں " مُحکَم " ہیں اور وہی " اُمّ الکتب " ہے ۔

(۲) دوسری " مُتشابہ " ہیں ۔

(۳) جن کے دلوں میں ٹیڑھاپن ہو وہ " مَا تَشَابَہَ مِنْہُ " ہی کا اتباع کرتے ہیں اور غرض یا تو فتنہ انگیزی ہوتی ہے یا تلاش نتیجہ ۔ حالانکہ جس حد تک کہ نتیجہ کی جستجو (تاویل) کا تعلق ہے اُس کو سوائے خدا کے کوئی دوسرا نہیں جانتا ۔

(۴) جو " علم راسخ " یعنی " یقین کامل " رکھتے ہیں وہ صرف یہی کہہ دیتے ہیں کہ چونکہ وہ بھی اللہ ہی کی نازل کردہ ہیں اس لئے ہم اُن پر بھی ایمان رکھتے ہیں ۔

اِن آیات سے مسلمانوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ :۔

(۱) قرآن دو حصّوں میں منقسم ہے ۔

(۲) ایک حصّہ " محکم " ہے یعنی صاف، واضح اور قابلِ عمل ناسخ۔

(۲) دوسرا " متشابہ " ہے یعنی مُبہم، ذومعنی اور ناقابلِ عمل منسوخ۔

(۳) " متشابہ " کی تاویل سوائے خدا کے کوئی دوسرا شخص نہیں جانتا اور اُس کی پیروی وہی کرتے ہیں جنکے دلوں میں کھوٹ ہے

(۴) جو مومن ہیں وہ صرف اُن پر ایمان رکھتے ہیں، بس ۔

علامہ حافظ ابن کثیر آٹھویں صدی ہجری کے مشہور مفسّر ہیں اور اُنھوں نے تیسری صدی ہجری سے ساتویں صدی ہجری تک کی تمام تفاسیر کو کھنگال کر " تفسیر ابن کثیر " تیّار کی ہے ۔ لہذا عام طور سے وہ بہت معتبر اور جامع سمجھی جاتی ہے ۔ چنانچہ وہ " محکم " اور " متشابہ " سے متعلق لکھتے ہیں :—

یہاں بیان ہو رہا ہے کہ قرآن میں ایسی آیتیں بھی ہیں جن کا بیان بہت واضح، بالکل صاف اور سیدھا ہے، ہر شخص اُن کے مطلب تک پہونچ سکتا ہے اور بعض آیتیں ایسی بھی ہیں جنکے مطلب تک عموماً ذہن رسائی نہیں کر سکتے، اب جو لوگ دوسری قسم کی آیتوں کو پہلی قسم کی طرف لوٹائیں، یعنی جس مسئلہ کی صراحت جس آیت میں پائیں لے لیں وہ تو راستی پر ہیں اور جو صاف اور صریح آیتوں کو چھوڑ کر ایسی آیتوں کو دلیل بنائیں جو اُن کے فہم سے بالاتر ہیں اور اُن میں اُلجھ جائیں، یہ وہ ہیں جو مُنہ

کے بل گر پڑے " اُمّ الکتٰب " یعنی اصل اصول کتابُ اللہ کی
وہ صاف اور واضح آئتیں ہیں، شک و شبہ میں نہ پڑو اور کھلے
احکام پر عمل کرو، اُنہی کو فیصلہ کرنے والی مانو اور جو نہ سمجھ میں
آئے اُسے بھی اُن سے سمجھو۔ بعض اور آئتیں ایسی بھی ہیں، کہ
ایک معنی تو اُن کا ایسا نکلتا ہے جو ظاہر آئتوں کے موافق ہو اور
ممکن ہے اُس کے سوا اور معانی بھی نکلیں، گو وہ صرف، لفظ اور
ترکیب کے اعتبار سے ہوں نہ کہ واقعی طور پر، تو اُن غیر ظاہر معنوں
میں نہ پھنسو، " محکم "اور" متشابہ " کے بہت سے معنی سلف سے
منقول ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو فرماتے ہیں
کہ " مُحکمات " وہ ہیں" جو ناسخ " ہوں جن میں حلال، حرام
احکام، حکم ممنوعات، حدیں اور اعمال کا بیان ہو ۔۔۔۔ حضرت
ابو فاختہ فرماتے ہیں یہ سورتوں کے شروع ہیں، یحییٰ بن یعمر
فرماتے ہیں یہ فرائض اور احکام اور روک ٹوک۔ اور حلال و حرام
کی آئتیں ہیں ۔۔۔۔۔۔ " مُتشابہات " اُن آئتوں کو کہتے
ہیں جو منسوخ ہیں اور جو پہلے کی ہیں اور جو پیچھے کی ہیں اور جن میں
مثالیں دی گئی ہیں۔ اور قسمیں کھائی گئی ہیں اور جن پر صرف
ایمان لایا جاتا ہے اور عمل کے لئے وہ احکام نہیں، حضرت ابن
عباسؓ کا بھی یہی فرمان ہے ۔۔۔۔۔۔ حضرت مجاہد کا قول ہے کہ
یہ ایک دوسرے کی تصدیق کرنے والی ہیں ۔۔۔۔۔ اور یہ بھی

مذکور ہے کہ یہ وہ کلام ہے جو ایک ہی طرز کے ماتحت ہو....."

(جلد ۱ صفحہ ۳۶)

یہ وہ تعریف ہے جو تیسری صدی ہجری سے ساتویں صدی ہجری تک کی گئی ہے یعنی یہ کہ "قرآن" کو دو حصوں میں منقسم کر کے "مُحکَم" اور "مُتَشَابِہ" کو ایک دوسرے کی ضد بتایا اور سمجھایا گیا ہے ۔ مگر آٹھویں صدی ہجری سے آج تک بھی "مُحکَم" اور "مُتَشَابِہ" کی یہی تعریف کی جا رہی ہے جو آپ آگے دیکھیں گے ، اور لطف یہ ہے کہ اس کے باوجود اب تک مسلمان یہ متعین نہیں کر سکے ہیں کہ "قرآن" کی کون کون سی آیتیں "مُحکَم" ہیں ؟ اور کون کون سی "مُتَشَابِہ" ؟ ۔ بہر کیف ! "مُحکَم" اور "مُتَشَابِہ" کی تعریف و تفسیر، کہ وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں ، ہرگز قابلِ قبول اور لائقِ اعتماد نہیں ہے اور اس اصول پر اب تک جس قدر بھی تعریفیں اور تفسیریں کی گئی ہیں اُن کی چُول ٹھیک نہیں بیٹھتی ۔ کیونکہ صورت حال یوں ہے کہ "سورہ آل عمران" میں تو یہ ہے کہ "قرآن" کی "کچھ آیتیں" مُحکَم ہیں اور "کچھ آیتیں" مُتَشَابِہ :-

اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْکِتٰبَ مِنْهُ "تم پر ہم نے وہ کتاب نازل کی ہے کہ
اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ اس میں محکم آیتیں بھی ہیں اور
وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۔ وہی "اُمُّ الکتاب" ہیں اور دوسری
(آل عمران ۱) "مُتَشَابِہ" بھی ۔"

اگر اتنا ہی ہوتا تو "محکم" اور "مُتَشَابِہ" آیات کی جو تعریف و تفسیر بھی

کی جاتی چُست، دُرست، اور ٹھیک ہو جاتی۔ مگر "سورۂ محمدؐ" میں "سورہ" کو "مُحکم" کہا گیا ہے:۔

فَاِذَآ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَۃٌ مُّحۡکَمَۃٌ "سو جب کوئی "مُحکم سُورۃ" نازل ہوتی ہے۔" (محمد ۳)

پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر سُورۂ ھُود میں "پورے قرآن" ہی کو "مُحکم" کہدیا گیا ہے:۔

کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ "وہ کتاب کہ جس کی آیات "محکم" ہیں پھر صاف صاف بیان کی گئی ہیں" (ھُود ۱)

اس آیت میں، کسی جزو کو مستثنیٰ کیے بغیر "پوری کتاب" ہی، تمام آیات ہی کو "مُحکم" (اُحۡکِمَتۡ، مُحکم کی گئی ہیں) کہہ دیا گیا ہے۔ پھر آگے بڑھ کر "سورہ زُمر" میں "پورے قرآن" ہی کو "مُتشابہ" بھی کہہ دیا گیا ہے:۔

اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡثِ کِتٰبًا "اللہ تعالیٰ نے کیسی عمدہ حدیث نازل کی ہے مُّتَشَابِہًا مَّثَانِیَ۔ (زمر ۳) وہ کتاب جو "متشابہ" ہے بار بار دہرائی گئی ہے"

پہلی آیت میں "قرآن" کی دو تعریف کی گئی ہے، اوّل یہ کہ اُس کی آیات "محکم" ہیں

لہ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ "کتاب" اور "حدیث"، دو چیز نہیں ہے بلکہ "کتاب" ہی کو "حدیث" کہا گیا ہے، یعنی "حدیث" قرآن سے علیحدہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے بلکہ "قرآن" ہی کا دوسرا نام "حدیث" ہے، اسی لئے بار بار، لوگوں سے سوال کیا گیا ہو کہ:۔

(باقی بر صفحہ ۱۶۷)

اور دوسری یہ کہ "صاف صاف بیان کی گئی ہیں"۔ اسی طرح دوسری آیت میں بھی "قرآن" کی "آیات" کی دو ہی تعریف کی گئی ہے اول یہ کہ "مُتَشَابِہ" ہیں دوسری یہ کہ "بار بار دہرائی گئی ہیں"۔ کہا جاتا ہے کہ "مُحْکَمْ" اور "مُتَشَابِہ" کو ایک دوسرے کی ضد سمجھو۔ یعنی "مُحکم" کا اُلٹا "مُتَشَابِہ" اور "مُتَشَابِہ" کا اُلٹا "مُحکَمْ"۔ اب اگر واقعی "مُحکَمْ" اور "مُتَشَابِہ" ایک دوسرے کی ضد ہیں تو یہ تماشا ہے کہ "سورۃ ال عمران" میں تو "کچھ آیتوں" کو محکم کہا گیا ہے اور کچھ کو "متشابہ"، مگر "سورۃ ہود" میں، بلا کسی استثناء کے، "پوری کتاب" ہی کی تعریف "مُحکَمْ" کی گئی ہے اور "سورۃ زمر" میں "پوری کتاب" ہی کو "مُتَشَابِہ" بھی کہا گیا ہے۔ مزید طرّہ یہ ہے کہ "سورۃ ال عمران" میں کہا گیا ہے کہ:۔ "مَا تَشَابَہَ مِنْہُ" کا اتباع وہی کرتے ہیں، جن کو "زیغِ قلب" ہے یعنی جن کے دل میں کجی ہے۔

(صفحہ ۱۴۶ کا باقی حاشیہ) قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ﴿اعراف ۱۸۵﴾ "واقعی ان لوگوں کی موت قریب آ گئی ہے بھلا اس کے بعد کون حدیث ہے جس پر ایمان لائیں گے؟" تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَ اٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ﴿جاثیہ ۶﴾ "یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو صحیح صحیح ہم تم کو سناتے ہیں تو پھر اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد دوسری کون یا کس کی حدیث ہے جس پر لوگ ایمان لائیں گے؟"

اور یہاں " سورۂ زُمر " میں " پورے قرآن " ہی کو " مُتَشَابِہ " کہہ دیا گیا ہے۔ اب نتیجہ کیا نکلا؟ پناہ بخدا یہی ناکہ :۔

" قرآن " کا اتباع " زیغ قلب کا ثبوت ہے۔

پھر دوسرا پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ سورہ آلِ عمران میں " کچھ آیتوں " کو " مُحکَم " کہا گیا تھا اور یہاں سورۂ ہود میں " پورے قران " ہی کو " مُحکَم " کہا گیا ہے، اب اگر پورا قرآن " مُحکَم " ہی ہے تو پھر اُسی قرآن کی " کچھ آیتوں " کا یا " پورے قرآن " کا " مُتَشَابِہ " ہونا کہاں باقی رہتا ہے؟ پھر دوسری دقّت یہ ہے کہ " مُتَشَابِہ " سے مراد اگر منسوخ آیتیں ہیں تو جب پورے قرآن کو " مُتَشَابِہ " کہا گیا تو پورا قرآن منسوخ قرار پاتا ہے اگر " مُتَشَابِہ " سے مراد مشکوک اور مُشتبہ ہے تو پھر پورے قرآن کو " مُتَشَابِہ " کیسے کہا گیا؟ نیز قرآن کو " ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ " بتا کے اُس کی صفت " لَا رَیْبَ فِیْہِ " ظاہر کی گئی ہے یعنی یہ ایسی کتاب ہے جس میں ذرا بھی شک وشبہ نہیں، اگر اس میں شک ہو جائے تو وہ ہدایت کے مصرف کا نہیں رہتا۔ اگر " مُتَشَابِہ " سے مُراد گنجلک، مبہم اور ناقابلِ فہم ہے تو نہ صرف یہ کہ جب پورے قرآن کو " مُتَشَابِہ " کہا گیا ہے تو پورا قرآن گنجلک، مبہم اور ناقابلِ فہم قرار پاتا ہے، بلکہ یہ صریحاً " قرآن " کے اصرار وادّعاء کے بالکل خلاف بھی ہوتا ہے۔ " قرآن " بار بار اور اصرار کے ساتھ اپنے کو " کتاب مُبین " اور " قرآن مُبین " کہتا ہے۔ یعنی " نہایت صاف کتاب " اور " بالکل واضح قرآن "۔ پھر اس دعوے کے بعد قرآن کی " آیتوں " یا پورے قرآن کا " مُتَشَابِہ " یعنی گنجلک، مبہم

اور ناقابلِ فہم ہونا کیا معنی ؟ ۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ " یہ اُس کتاب کی آیات ہیں، جو

(شعراء ۱) " المبین " ہے نہایت واضح ہے "

بھلا جو قرآن " اَلْمُبِیْن " ہو نہایت واضح، بالکل روشن، کُھلا ہوا، اور قطعاً صاف صاف ہو، اُس کا گنجلک، مبہم اور ناقابلِ فہم ہونا کیا معنی ؟

(۱) اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ " تم پر ایسی آیات نازل کی ہیں جو

(نور ۴) نہایت واضح ہیں ۔ "

(۲) لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ " بلاشبہ ہم نے واضح اور کھلی ہوئی

(نور ۶) آیات نازل کی ہیں ۔ "

(۳) رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ " وہ رسول جو تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ

اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ (طلاق ۲) کی صاف اور واضح آیتیں تلاوت کرکر کے سُناتا ہے "

" آیات " کو " مُبَیِّنٰت " کہا گیا ہے، پھر قرآن کی " آیات " کا مُبہم ہونا کیا معنی ؟ ذرا قرآن کے اس، اُلٹ پھیر کر کے، اصرار کو دیکھئے :۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ " یہ اُس کتاب کی آیتیں ہیں جو " قرآن

(حجر ۱) مُبین " (واضح قرآن) ہے ۔ "

تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ " یہ اس قرآن کی آیتیں ہیں جو " کتابِ مُبین "

(نمل ۱) (واضح کتاب) ہے ۔ "

بھلا ایک " واضح قرآن " اور " واضح کتاب " کی " آیتیں " گنجلک، مبہم اور ناقابلِ فہم کس طرح ہو سکتی ہیں ؟ اللہ تعالیٰ کو اپنے نازل کردہ " قرآن کے

بہایت واضح ہونے پر اس قدر اصرار ہے کہ وہ اپنی اس واضح کتاب کی قسم کھاتا ہے :-

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (زخرف ۱) " اس واضح کتاب کی قسم "

اللہ تعالیٰ کا دعویٰ ہے کہ اُس کا نازل کیا ہوا یہ قرآن، بلاکسی استثنا کے بس صرف " نور " ہی " نور " ہے۔ یعنی واضح کتاب :-

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (مائدہ ۳) " لو! تمہارے پاس اللہ کیطرف سے " نور " آگیا اور وہ کتاب آئی ہے جو نہایت واضح ہے"

حضرت علامہ ابوالکلام آزاد اپنی " ترجمان القرآن " کی جلد دوم صفحہ ۲۹۵ پر فرماتے ہیں :-

" قرآن نے جابجا، اپنے اس وصف پر زور دیا ہے کہ وہ "مُبین" ہے، یعنی ظاہر ہے، نمایاں ہے، روشن ہے، مگر کس بات میں؟ اپنے مطالب میں، اپنی دعوت میں، اپنے دلائل وآیات میں، اُس کی کوئی بات نہیں جو اُلجھی ہوئی ہو، مشکل ہو، ناقابلِ فہم ہو، ہر ذہن اُسے بوجھ لے سکتا ہے، ہر دل اُسے قبول کرلے سکتا ہے ہر روح اُس پر مطمئن ہو جا سکتی ہے، وہ زیادہ سے زیادہ سیدھی سادی بات ہے، جو انسان کے دل ودماغ کے لئے ہو سکتی ہے کیونکہ وہ " سچائی " ہے۔ اور سچائی کی کوئی بات مشکل اور اُلجھی ہوئی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ " قرآن " نے اپنے کو " النُّور " کہا ہے، یعنی " روشنی "۔ روشنی کا خاصہ ہے

کہ ہر بات کو نمایاں کر دیتی ہے، کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی اگر وضاحت اور نمود نہیں ہے تو پھر اُجالا بھی نہیں، اُجالا جب کبھی ہوگا، وضاحت و نمود اپنے ساتھ لائے گا۔"

قرآن نے "چاند" کے تابناک اور روشن عنوان سے (یعنی "سورۂ قمر" میں) چار بار دعویٰ کیا اور دعوت دی ہے کہ:۔

لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۔ (قمر) "بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے، بہت آسان کر دیا ہے، سو ہے کوئی جو نصیحت حاصل کرے؟

کیا اِن باصرار دعوؤں کے بعد بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کی "کچھ آیتیں" یا "پورا قرآن" گنجلک، مبہم اور نا قابلِ فہم ہے؟ ۔ کوئی آیت اگر سمجھ میں نہ آئے تو یہ ہماری عقل، علم اور فہم، کے خام، ناپختہ اور ناقص ہونے کا ثبوت ہوگا نہ کہ خود "قرآن" ہی کے گنجلک، مبہم اور نا قابلِ فہم ہونے کا ؟:۔

(۱) كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (حم سجدہ) "وہ کتاب جس کی آیتیں خوب صاف صاف بیان کی گئی ہیں۔

(۲) قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (زمر ۳ رکوع) "عربی قرآن جس میں ذرا بھی کجی نہیں ہے"

اسلام میں "ایمان و عمل" کا ہر فردِ بشر تنہا ذمّہ دار بنایا گیا ہے، وہ خود اپنے آپ مکلّف ہے ۔ پھر "ہر فردِ بشر" کی ہدایت کا سرچشمہ "قرآن" کو قرار دیا گیا ہے کیا ایسی صورت میں "قرآن" کی آیتیں ایسی ہو سکتی ہیں، کہ مبہم ہوں اور کسی کی سمجھ میں نہ آئیں ؟ اور یوں بھی جب خود اصرار کے ساتھ "قرآن" کسی استثناء

کے بغیر، اپنے کو واضح اور آسان اور تفصیلی کتاب بتا رہا ہے تو یہ استثناء انسانی کیسی کہ " قرآن کی کچھ آیتیں صاف، واضح اور قابل فہم نہیں ہیں ؟ -

بہرکیف ! " قرآن " کے " مُحکم " اور " مُتشابہ " کی جتنی بھی تعریفیں اور تفسیریں، اب تک متعیّن کی گئی ہیں قطعاً ناقابلِ اطمینان ہیں -

کیونکہ بات " آیات " ہی تک محدود نہیں کہ جو بھی تعریف کر دیجئے وہ ٹھیک ہو جائے، بلکہ بات " پورے قرآن " تک پہونچ گئی ہے - لہذا یہ ہو نہیں سکتا کہ " قرآن " کی " آیتوں " کو دو حصّوں میں بانٹ کر، دونوں حصّوں کو ایک دوسرے کی ضد قرار دے کر کوئی تعریف متعیّن کر دی جائے، کیوں کہ اللہ تعالے کا دعویٰ یہ ہے کہ :-

(۱) قرآن کی ــــ " کچھ آیتیں " ــــ " مُحکم " ہیں (آل عمران)

" پورا قرآن " ــــ " مُحکم " ہے (ھود)

(۲) کتاب کی ــــ " کچھ آیتیں " ــــ " مُتشابہ " ہیں (آل عمران)

" پوری کتاب " ــــ " مُتشابہ " ہے (زُمر)

سوچئے کہ بات کیا بنی ؟ اب تک جو کچھ " مُحکم " اور " مُتشابہ " کی تعریف و تفسیر بیان کی گئی ہے، اُس کو یہاں چسپاں کر کے دیکھئے کہ کل بیٹھ جاتی ہے یا نہیں ؟

ساتویں صدی ہجری تک کی، کی ہوئی تعریفیں اور تفسیریں، علامہ " ابن کثیر " کی تفسیر کے اقتباس میں آپ دیکھ چکے ہیں، اب آٹھویں صدی ہجری سے اب تک کی تعریفوں اور تفسیروں کے لئے علامہ عبدالحکیم خاں مؤلف " تفسیر القرآن بالقرآن "

کی بیان کی ہوئی تفسیر ملاحظہ فرمایئے۔ وہ سورۃ "ال عمران" کی اسی زیر بحث آیت کے ترجمے کے بعد اس کی "تفسیر" میں لکھتے ہیں :-

"مُحْکَمْ" اور "مُتَشَابِہ" کے معنی میں، مفسرین نے بہت اختلاف پیدا کر کے پیچ و تاب کھاتے ہیں ذیل میں ہم اُن کا مختصر بیان کرتے ہیں :-

(۱) قرآن مجید ایک مقام پر فرماتا ہے کِتَابٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ (۱۱/۱) یہ کتاب ایسی ہے کہ اُس کی آیتیں "مُحْکَمْ" کی گئی ہیں، ... دوسرے مقام پر ہے اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ، کِتٰبًا مُّتَشَابِھًا (۳۹/۲۳) اللہ نے نہایت ہی عمدہ کلام اُتارا ہے یعنی وہ کتاب جو "مُتَشَابِہ" ہے۔ تیسرا مقام یہی ہے جس پر یہ بحث ہو رہی ہے، ...... ان آیات پر نظر ڈالنے سے ثابت ہوتا ہے کہ کُل قرآن "مُحْکَمْ" بھی ہے اور "مُتَشَابِہ" بھی۔ اور ایک لحاظ سے بعض حصّے "مُحْکَمْ" ہیں، اور بعض "مُتَشَابِہ"۔ ظاہر النظر میں یہ تینوں بیان ایک دوسرے کے مخالف معلوم ہوتے ہیں، مگر حقیقتاً اختلاف قرانی آیات میں ممکن نہیں، کیونکہ قرآن مجید خود فرماتا ہے وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (۴/۸۲) اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں اختلاف ضرور پاتے پس صاف یہ نتیجہ نکلا کہ یہ اختلاف مختلف طبقات انسانی کے لحاظ سے ہے

ایک تو ادنیٰ درجہ کی لیاقتوں کے لوگ ہیں جو بلا سمجھائے کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے، اُن کے لحاظ سے تمام قرآن "مُتَشَابِہ" ہے، دُوم اعلیٰ درجہ کے لوگ ہیں جو منازل قرآن طے کر کے تمام قرآن کو صاف طور پر سمجھ چکے ہیں اُن کے لحاظ سے تمام قرآن "مُحْکَم" ہے۔ سوم درمیانی درجہ کے لوگ ہیں جن کے نزدیک بعض حصے قرآن کے "مُحْکَم" ہیں اور بعض "مُتَشَابِہ" پس "مُتَشَابِہ" کے یہ معنی کرنا کہ وہ کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتے، قرآن مجید کے ایک حصۂ کثیر کو بلکہ تمام کو، لغو اور فضول قرار دینا ہے۔

(۲) بخاری میں مجاہد کی تفسیر سے "مُتَشَابِہ" کے یہ معنی لکھے ہیں کہ يُفَسِّرُ بَعْضُهُ بَعْضًا۔

(۳) تیسرے معنی "مُتَشَابِہ" کے "بَطْنِ قرآن" کئے گئے ہیں، جیسا کہ ابن مسعود سے روایت ہے ...... کہ ہر آیت میں ظہر اور بطن ہے اور ہر حد کے لئے ایک مطلع ہوتا ہے۔ ظہر سے مراد "مُحْکَم" اور بطن سے مراد "مُتَشَابِہ" ہے ان معنوں کی تائید قرآن مجید سے ہوتی ہے کیونکہ "محکمات" کی نسبت فرمایا ہے "هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ" جب محکمات کل کتاب کی ماں ہوئی تو ظاہر ہے کہ جو اُس کے بطن سے نکلے وہ "مُتَشَابِہ" ہے، اس لحاظ سے کُل قرآن مجید ظاہری معنی کے

لحاظ سے " مُحکَم " ہے اور باطنی لحاظ سے " مُتشابِہ "

ہے ......"

(۴) مُحکَمات وہ آیات ہیں جن میں دوسرے معنی کا احتمال نہ ہو سکے اور جو مطلب ہے وہ صاف صاف سمجھ میں آسکے، چنانچہ توحید اور اعمالِ حسنہ کے متعلق جس قدر آیات ہیں وہ صاف اور " مُحکَم " ہیں، اور " مُتشابِہات " وہ آیات ہیں، جن کے کئی معنی ہو سکیں یا تمثیل یا مجازیا استعارہ پایا جائے مثلاً بہت سی آیات ذات وصفات باری تعالیٰ، احوالِ بہشت و دوزخ اور کیفیتِ ملائکہ و رُوح کے بارے میں ہیں ..... پس " مُتشابِہات " میں بحثیں کرنا سراسر لغو ہے، اُن کی حقیقت کو خود اللہ کریم ہی جب چاہے اپنے سچے طالب پر خود ظاہر فرماتا ہے وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ (۳/۷) ....." صفحہ ۱۸۱

اس اقتباس میں اور کوئی بات تو قابلِ ذکر نہیں ہے کہ جس کے بارے میں کچھ کہنے کی مزید ضرورت ہو۔ اِلّا یہ کہ فاضل مفسر نے " مُتشابِہ " کی یہ نئی تعریف پیش کی ہے کہ اس سے مراد قرآن کی وہ آیتیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، احوالِ بہشت و دوزخ اور کیفیتِ ملائکہ و روح کا ذکر ہے چونکہ انسان کی علمی دسترس ان حقائق کا ادراک نہیں کر سکتی اس لئے انکے ذکر والی آیات کو " مُتشابِہ " کہا گیا ہے، یہ تفسیر شاید مان لی جاتی، مگر فاضل مفسر نے اعتراف کے باوجود اس کی توجیہ کہیں پر نہیں کی کہ مسئلہ پورے قرآن

کو "مُتشابہ" کہنے کا ہے، کیا پورا قران ہی صرف اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات اور ملائکہ و روح کے ذکر پر مشتمل ہے؟ اگر نہیں تو پورے قران کو "مُتشابہ" کیوں کہا گیا؟ قرآن جب "پورے قرآن" کو دعویٰ کیساتھ "مُتشابہ" کہہ رہا ہے۔ اور پھر یہ بھی صاف صاف کہہ رہا ہے کہ "مَاتَشَابَہَ مِنۡہُ" کا اتّباع وہی کرتے ہیں جن کے دلوں میں کجی ہے، تو "مُتشابہ" کی یہ تعریف کیسے صحیح ہو سکتی ہے کہ اس سے مُراد، ذات و صفاتِ الٰہی اور ملائکہ و روح کے ذکر والی آئتیں ہیں؟ عام بول چال بھی، تاریخ اور سوانح بھی، احکام و اقوال بھی، کیا سب "مُتشابہ" ہیں۔؟ لہٰذا یہ تعریف و تفسیر صحیح اور مطمئن کرنے والی نہیں۔

فاضل مفسّر کی یہ تفسیر بھی نادرست ہے، کہ "قرآن" اعلیٰ قابلیتوں کے لوگوں کے لئے "مُحکَم" ہے اور ادنیٰ صلاحیت والوں کے لئے "مُتشابہ"۔ — بھلا یہ "قران فہمی" کی تقسیم ہوئی، یا "آیاتِ متشابہات" کی تفسیر؟ اور پھر قرآن دعویٰ کرتا ہے کہ مَاتَشَابَہَ مِنۡہُ کا جو لوگ "اتباع" کرتے ہیں، اُن کے "دلوں میں کھوٹ" (زیغ قلب) ہے پھر کیا، ادنیٰ قابلیت والوں کے لئے، پورے قران ہی کی پیروی "دلوں میں کھوٹ" رکھنا کہلائے گی؟ اسی طرح اگر اعلیٰ قابلیت والوں کے لئے پورا قرآن "مُحکَم" ہے۔ تو کیا اعلیٰ قابلیت والے یہ جان اور سمجھ گئے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات اور ملائکہ و رُوح کی صحیح حقیقت کیا ہے؟ اگر اُنھوں نے بھی نہیں سمجھا ہے تو پھر اُن کے لئے یہ قران "مُحکَم" کیسے ہوا؟۔

آگے چل کر، فاضل مفسّر نے پھر فرمایا ہے اور اس امر پر بڑا زور صرف فرمایا ہے۔ کہ "مُتَشَابِہ" وہی آیات ہیں جن میں خدا تعالےٰ کی ذات وصفات یا جنّت و دوزخ یا عرش و کرسی وغیرہ کا ذکر ہے۔ کیونکہ ان کا احاطہ انسانی علم و فہم کی دسترس سے باہر ہے۔ اُن کو اصرار ہے کہ "مُتَشَابِہ" سے مراد وہ عنوانات و مطالب ہیں جن کا تعلق ماوراء عقل حقائق سے ہے، اور انسان عقل و حواس کے ذریعے اُن کا احساس وادراک نہیں کر سکتا، چنانچہ فاضل مفسّر چیلنج کرتے ہیں کہ :۔

"قرآن مجید نے جس مضمون کے بیان کے واسطے "مُتَشَابِہ" الفاظ استعمال کئے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ اُن سے بڑھ کر اور ان سے زیادہ صاف الفاظ ہو ہی نہیں سکتے، مثلاً خدا سمیع و بصیر اور حکیم و خبیر ہے...... ان سے بڑھ کر کوئی الفاظ تجویز کر کے دکھاؤ، اسکی معلومات، تصرفات اور قدرت ظاہر کرنے کے واسطے، ان سے زیادہ عام فہم الفاظ ہو ہی نہیں سکتے۔"

میں پوچھتا ہوں کہ تو، اس سے یہ کیسے نتیجہ نکلا کہ خدا کی صفات وغیرہ جن "آیات" میں مذکور ہیں وہ "مُتَشَابِہ" ہیں؟ تسلیم کہ بہت سے حقائق اوصفائی بیان ہمارے علم و عقل کی دسترس سے باہر ہیں مگر یہ کس طرح ثابت ہوا کہ جو آیات ایسے حقائق کی حامل ہیں وہ "متشابہ" ہیں؟ آخر "متشابہ" کے معنیٰ "کیا ہیں؟

وہ جو کسی نے کہا ہے، خوب ہی کہا ہے :۔

رات کو خواب میں زُلفیں تری برہم دیکھیں ؛ ظاہر ہوتی ہیں اِس خواب کی تعبیریں دو

یا تو وہ مارِ سیہ، جان کے خواہاں ہونگے ٭ یا جنوں پاؤں میں پہنائے گا زنجیریں دو

اب تک تو لفظ "مُتَشَابِہ" کے صرف دو ہی معنی بیان ہوتے ہیں:۔

(۱) وہ جس میں شک و شبہ ہو۔

(۲) وہ جو ملتا جلتا ہوا ہو۔

"قرآن" نے "لفظ" کو تو کہیں پر "مُتَشَابِہ" کہا نہیں ہے کہ آپ یہ فرمائیں کہ ان صفات و حقائق کو تمثیلی انداز سے ہمارے روز مرّہ کے مستعمل الفاظ سے مشابہ لفظوں میں بیان کیا گیا ہے اور نہ حقیقتاً سمیع و بصیر وغیرہ "متشابہ" الفاظ ہی ہیں۔ قرآن نے تو "آیات" کو "مُتَشَابِہ" کہا ہے، پھر یہ "آیات" کس معنی میں "مُتَشَابِہ" ہیں؟ کیا اِس معنی میں کہ ان میں انسان سے ملتی جلتی صفات مذکور ہیں۔؟۔ اگر ایسا ہے تو وہ "آیات" ناقابلِ فہم اور ماوراءِ عقل و ادراک کیونکر ہوئیں؟ ہم نے سمجھ لیا ہے کہ اللہ ہماری طرح، دیکھتا، سنتا سب ہے، فرق بھی ہم جانتے ہیں کہ ہمارا دیکھنا اور سننا محدود ہے۔ اور اللہ کا لامحدود۔ یا ہمارا دیکھنا سننا ناقص ہے اور اللہ کا کامل۔ پھر وہ آیات" ہماری سمجھ سے باہر کیونکر ہوئیں اور اس معنی میں وہ "آیات" "مُتَشَابِہ" کس طرح قرار پا سکتی ہیں؟۔

اور اگر ذات و صفاتِ باری والی "آیات" اس معنی میں "مُتَشَابِہ" ہیں کہ اُن میں شک و شبہ ہے، تو پھر آپ نے ان صفات پر "ایمان" کیا اور کیسے لایا ہے؟ "ایمان" کے تو معنی ہی ہیں "یقینِ کامل" کے اور لفظ "ایمان" ضد ہے "شک" کا۔ اگر ان صفات پر "شک" ہے اور

اس معنی میں وہ صفات والی آیات " مُتَشَابِہ " ہیں تو پھر دعویٰ " ایمان " غلط ہے ۔ اور اگر واقعی ان صفات میں ہم کوئی " شک و شبہ " نہیں کرتے بلکہ " ایمان " یعنی " یقین کامل " رکھتے ہیں ، تو اُن کی تعریف " مُتَشَابِہ " (یعنی شک و شبہ والی آیات) کیسے صحیح قرار پاسکتی ہے ؟

" متشابہ " کی تعریف بھی کی گئی ہے کہ اس سے مراد حروف مقطّعات یا قرآن کی وہ آیات ہیں جن کو دوسری آیتوں سے ملائے یا ماتحت کئے بغیر مفہوم متعیّن نہیں ہوتا ، یہ تعریف بھی ناقابلِ اطمینان ہے ، کیونکہ ایک طرف تو سورۂ زمر میں پوری کتاب کو " متشابہ " کہا گیا ہے ، اور دوسری جانب سورۂ آل عمران میں " مَا تَشَابَہَ مِنْہُ " کے اتبّاع کو " زیغ قلب " سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ اب نہ تو پورا قرآن محض " حروف مقطّعات " ہے اور نہ جو حروف مقطّعات ہیں ان کا کوئی تعلّق " اتبّاع " سے ہے ۔ لہذا یہ تفسیر و تعبیر بھی مسئلہ کا حل نہیں پیش کرتی ۔

" متشابہ " کے سلسلے میں یہ خیال بہت عام ہے اور بلا استثناء سارے لوگ اس امر پر متفق الرّائے ہیں کہ " قرآن " نے اپنی ہی " آیتوں " میں سے کچھ کو " مُحْکَم " کہا ہے اور کچھ کو " مُتَشَابِہ " ۔

اور یہ کہ " قرآن " نے اپنی آیتوں کو اپنی ہی آیتوں سے " متشابہ " کہا ہے ۔ چنانچہ علامہ آزاد نے بھی " ترجمان القرآن " جلد دوم صفحہ ۱۷ میں آخرت سے بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے :۔

قرآن نے اسی لئے مطالبِ وحی کی دو قسمیں ٹھرائی ہیں " محکمات " اور " متشابہات "

مگر یہ خیال ہرگز قابلِ قبول نہیں ہے کہ قرآن نے اپنی آیتوں کو اپنی ہی آیتوں سے

"مُتَشَابِہ" بھی کہا ہے، آخر کس سے "مُتَشَابِہ" کہا ہے؟ "مشابہت" کا لفظ دو متفرق اور الگ الگ چیزوں پر بولا جاتا ہے کوئی آدمی، کسی دوسرے شخص سے "مُتَشَابِہ" ہو تو کہیں گے کہ فلاں شخص، فلاں سے "مشابہ" ہے۔ یا کسی شخص کی کوئی چیز کسی دوسرے آدمی کی کسی چیز سے، ملتی جلتی ہو، تو کہیں گے فلاں کی ناک، فلاں شخص کی ناک کے "مشابہ" ہے۔ خود حُفّاظِ قرآن، کی اصطلاح میں جو "متشابہ لگنا" بولتے ہیں، اس سے مراد، دو مختلف جگہوں کی دو متفرق آیتیں ہوتی ہیں۔ اِس طور پہ ہمیشہ دو جدا جدا چیزوں کی یکسانیت و مماثلت پر "مشابہت" کا لفظ بولا جاتا ہے، یہ نہیں کہ ایک ہی شخص میں "مشابہت" ظاہر کی جائے۔ ہر شخص کو ۲ ۲ دو ہاتھ ہوتے ہیں مگر کوئی نہ خود یہ بولتا ہے، کہ ہمارا دایاں ہاتھ، بائیں ہاتھ سے "مشابہ" ہے۔ اور نہ دوسرے یہ کہتے ہیں کہ فلاں کا بایاں ہاتھ، اُس کے دائیں ہاتھ سے "مشابہ" ہے۔ ایک ہی شخص کی دونوں آنکھوں میں "مشابہت" کوئی بھی نہیں ظاہر کرتا ہے۔ ہاں ۲ دو شخصوں کی آنکھیں اگر ایک سی اور ملتی جلتی ہوتی ہیں تو کہتے ہیں کہ فلاں اور فلاں کی آنکھوں میں بڑی "مشابہت" پائی جاتی ہے، یہ روزمرہ کی بات ہے، قرآن فصاحت و بلاغت کا وہ مرتبہ رکھتا ہے جس کے لئے "حرفِ آخر" کہنا بھی بالکل ناکافی ہے، پھر قرآن اپنی آیتوں کو، خود اپنی ہی آیتوں سے کس طرح "متشابہ" کہہ سکتا ہے؟ اور جب قرآن نے اپنے کو کُلیتًا اور

تمامتر "مُتَشَابِہ" کہدیا تو اس سے کیا مراد لیا جائے گا؟ لہذا یہ خیال ہرگز قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ قرآن نے، اپنی ہی "آیتوں" کی تعریف "مُتَشَابِہ" کے لفظ سے کی ہے۔ آخر کس سے "مشابہت" ظاہر کی ہے؟ ایسی صورت میں صاف ظاہر ہے کہ "قرآن" نے اپنے اندر ہی کی "آیتوں" کے لئے "مُتَشَابِہ" کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ بلکہ اپنے کو، یا اپنی "آیات" کو دوسری کتابوں یا اُن کی "آیات" سے "مُتَشَابِہ" بتایا ہے۔

سورۂ "آلِ عمران" مدنی سورہ ہے۔ "مدینہ" میں یہود، نصاریٰ، زرتشتی صابئین، سب ہی تھے اور سبھوں کو دعویٰ تھا، کہ میرے پاس "الہامی صحیفہ" اور "آسمانی کتاب" ہے اور واقعی تھیں بھی۔ فرق یہ ہے کہ تمامتر اصلی حالت میں نہ تھیں۔ اُن کی کچھ تعلیمات گُم ہو چکی تھیں اور کچھ اُن کی تحریفی تحریروں میں اس طرح گڈمڈ ہو چکی تھیں کہ صحیح تعلیماتِ خداوندی کا ان کتابوں سے مسلمانوں کو پتہ چلنا مشکل تھا، یعنی اہلِ مذاہب نے "یا تو اپنی کتابیں سرے سے بدل ڈالی تھیں یا کم و بیش مختلف مسائل میں اس طرح حک و اضافہ اور ترمیم و تنسیخ کر ڈالی تھیں کہ ان کو دیکھ کر مسلمانوں کے لئے یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ واقعی ان کا کس قدر حصّہ، کون سا ٹکڑا یا کون سا حکم اصلی ہے، اور کون سا یا کتنا تحریفی؟

ان تمام اہلِ مذاہب کا عالم یہ تھا کہ:-

یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْھِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ "کتابوں کو اپنے ہاتھوں سے لکھ لیتے۔ اور لوگوں هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ۔ (بقرہ ۹) سے کہتے۔ کہ یہ وہ ہے جو خدا کی طرف سے آئی ہے"

يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ وہ کتاب کے سلسلے میں کج زبانی کرتے ہیں
مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ تاکہ تم لوگ اُس کو کتاب کا جزو سمجھو حالانکہ
وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا وہ ہرگز کتاب کا جزو نہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ کتاب
هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ اللہ کی طرف سے ہے اور ہرگز وہ اللہ کی طرف سے
الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۔ نہیں بلکہ وہ لوگ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اور
(آل عمران ۸) ان تمام باتوں کا پورا پورا علم رکھتے ہیں ۔"

بات یہ ہے کہ ان تمام اہلِ کتاب کو کتاب تو واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ملی گئی تھی مگر چونکہ قرآن کی طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کتابوں کی حفاظت اپنے ذمے نہیں لی تھی، بلکہ اُن کا محافظ و نگراں، اُن ہی مذاہب کے علماء اور مشائخ کو بنا دیا گیا تھا :۔

وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا ۔ اور علماء و مشائخ اُن کے کتاب کے
اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ محافظ قرار دیئے گئے تھے اور وہی اُس کی
وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ (مائدہ) خبرگیری پر گواہ بنائے گئے تھے ۔"

انسانی حفاظت ناقص تھی لہذا تمام کتابیں، آہستہ آہستہ کر کے محرف ہو گئیں۔ جلدیں رہیں، اگر نام متعین تھا تو وہ بھی رہا، مگر اُن میں صرف خدائی احکام نہ رہے، گڈمڈ اور خلط ملط ہو گئے۔ کچھ خدائی احکام بجنسہ رہے، کچھ کم و بیش و رد و بدل کر دیئے گئے۔ کچھ سرے سے بدل ہی دیئے گئے کچھ بالکل ہی حذف کر دیئے گئے، کچھ میں اضافہ کیا گیا، اس طور پر وہ صرف خدائی احکام کا مجموعہ نہیں رہیں بلکہ لوگوں کی خواہشوں کا مجموعہ ہو کر رہ گئیں، اور یہ تمیز مشکل ہو گئی کہ فلاں معاملے میں خدائی

منشاء کیا تھا؟ اس طور پر وہ تمام کتابیں محرّف ہو کر "دین" کی صحیح رہنمائی کے لئے بے کار و بے مصرف ہو گئی تھیں، وہ سرچشمۂ ہدایت نہ رہی تھیں بلکہ وہ تالاب بن گئی تھیں جن میں کا صاف پانی، کیچڑ اور خس و خاشاک سے ملوث ہو کر پینے کے قابل نہ رہا ہو، "پانی" تو ہو مگر اس کا خاشاک سے علیحدہ کرنا دشوار ہو، یہود و نصاریٰ ہی کے لئے نہیں، بلکہ مسلمانوں کے لئے، دنیا والوں کے لئے۔

"قرآن" کا نزول "مکہ" سے شروع ہو چکا تھا اس کا سلسلہ مدینہ میں بھی رہا، "قرآن" اپنے سے پہلے کے تمام اگلے صحائف کی "تصدیق" کر رہا تھا، مگر درحقیقت وہ "اصل کتاب" کی آمد و نزول کا مصدق تھا:-

وَأَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ۔ (مائدہ ۷)

"اے محمد! ہم نے تم پر ایک سچائی والی کتاب نازل کی ہے جو تصدیق کرتی ہے ان تمام کتابوں کی جو اس سے پہلے ہوئی ہیں اور یہ کتاب اُن کتابوں پر حاوی بھی ہے سو تم ان لوگوں کے معاملات میں بھی اسی کتاب سے فیصلہ کیا کرو جو تمہارے پاس سچی کتاب بھیجی گئی ہے اللہ کی طرف سے اور تم اُن لوگوں کی خواہشات کا اتباع ہرگز نہ کرنا۔"

"قرآن" اُن کتابوں کا تمام تر مصدق نہ تھا جو محرّف ہو کر، ان کی خواہشات کا مجموعہ بن چکی تھیں، اس لئے رسول اللہ سے کہدیا گیا کہ اُن کے معاملات میں بھی "قرآن" ہی سے فیصلہ کیا کرو کیونکہ وہ سچّی ہے اور ان کی کتابیں خدائی احکام کا نہیں بلکہ اُن کی خواہشوں کا مجموعہ بن گئی ہیں۔ اور تم نہیں جان سکتے کہ کون سا حصّہ اصلی اور

کون سا تحریفی ہے۔ نیز یہ کتاب، تعلیمات کے لحاظ سے، اُن سے مختلف بھی نہیں بلکہ اُن کتابوں پر حاوی بھی ہے۔ اس لئے تم کو ضرورت نہیں کہ اُن کی "پیروی" کرو۔ نیز "قرآن" تمام "اہلِ کتاب" کو دعوت بھی دے رہا تھا کہ تم لوگ اس "قرآن" پر بھی ایمان لاؤ۔ ورنہ "مومن کامل" کیا معنی، کچھ بھی نہیں رہو گے :۔

یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ اے اہل کتاب! تم کسی بھی راہ پر نہیں ہوگے
حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰۃَ وَالْاِنْجِیْلَ جب تک کہ تم توراۃ، انجیل اور اس کتاب
وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ پر جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل
کی گئی ہے قائم نہ ہوگے۔" (مائدہ ۱۰)

نیز "قرآن" انھیں سمجھا رہا تھا کہ "قرآن" کوئی عجیب اور انوکھی کتاب نہیں ہے بلکہ اس میں بھی وہی کچھ ہے جو اس سے پہلے کی کتابوں میں تھا سب کتابوں کی اصلی تعلیمات، اصولی حیثیت سے ایک تھیں :۔

اِنَّ ھٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی بلاشبہ یہی کچھ پہلے کے صحائف میں بھی تھا
صُحُفِ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی۔ مثلاً ابراہیم اور موسیٰ کے صحائف میں۔"

ان حالات میں یہ ضروری تھا کہ مسلمانوں کے سامنے "قرآن" اور اس سے پہلے کی "تمام کتابوں" کی صحیح صحیح پوزیشن لاکر مسلمانوں کو سمجھا دیا جائے۔ "قرآن" اور "اس سے پہلے کی کتابوں" کا فرق اُن کو بتا دیا جائے، اور ان کو متنبہ کر دیا جائے کہ کہیں غلطی سے "قرآن" کی تصدیق دیکھ کر، اُن محرف صحائف کو تمام تر "اصل صحائف" سمجھ کر، اُن کی پیروی میں بھی، مسلمان، کوئی حرج اور خرابی نہ

سمجھنے لگیں ۔ اِس فہائش کے لئے سورۃ آلِ عمران کی آیت زیرِ بحث نازل ہوئی۔

اسی لئے زیرِ بحث آیات سے پہلے کی موجود کتابوں کا ذکر آیا ہے :۔

اَنْزَلَ التَّوْرٰۃَ وَالْاِنْجِیْلَ مِنْ ، اور ہم نے تورٰۃ وانجیل اس سے پہلے

قَبْلُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ نازل کیا تھا ، لوگوں کی ہدایت کے لئے

الْفُرْقَانَ ۔ (ال عمرآن ۱) اور اب فرقان نازل کیا ہے ۔ "

لہٰذا " مُحْکَمْ " اور " مُتَشَابِہٖ " کی یہ تعریف صحیح نہیں ہے کہ خود " قرآن " ہی دو حصوں میں منقسم ہے ۔ یا " مُحْکَمْ " اور " مُتَشَابِہٖ " ایک دوسرے کی ضد ہے ۔ یا " مُحْکَمْ " سے مراد " قرآن " کی صاف ، واضح اور قابلِ فہم آیتیں اور " مُتَشَابِہٖ " سے اُسی قرآن کی گنجلک ، مُبہم اور ناقابلِ فہم آیات مراد ہیں ۔

دراصل " مُحْکَمْ " اور " مُتَشَابِہٖ " قرآنی آیات یا پورے قرآن کی دو تقسیم نہیں ہے ، جیسا کہ اب تک سمجھا گیا یا سمجھا یا جاتا ہے ۔ اور وہ ایک دوسرے کی مخالف نہیں ہے ۔ بلکہ " مُحْکَمْ " اور " مُتَشَابِہٖ " قرآن کی دو عظیم صفتیں ہیں ۔

" مُحْکَمْ "

قرآنی آیتوں یا پورے قرآن کو " مُحْکَمْ " اِس معنی میں کہا گیا ہے کہ اب یہی قرآن " قولِ فیصل " ہے " حرفِ آخر " ہے " ناقابلِ تغیّر " ہے :۔

اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ (طلاق ۱) " بلاشبہ یہ قول فیصل ہے ۔ "

یہی قرآن " حکمتِ بالغہ " ہے :۔

حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ (قمر ۱) " اعلیٰ درجہ کی حکمت ہے۔"

یہی قرآن " مفصّل کتاب " ہے :۔

الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا (انعام ۱۱۴) " وہ کتاب جو مفصّل ہے ۔"

یہ قرآن کبھی نہ بدلنے والا، ہمیشہ باقی اور نافذ رہنے والا ہے۔ " مُحْكَمٌ " کے معنی ہیں مضبوط، مستعد، ناطق، غیر محرّف، واضح غیر محتاج، باقی، اٹل اور کبھی نہ بدلنے اور اپنی جگہ سے نہ ٹلنے والا۔ چونکہ " قرآن " اب کسی دوسری کتاب سے نہ بدلے گا۔ اور چونکہ وہ کسی دوسری کتاب کا محتاج نہیں اور نہ کبھی کسی طرح کی کوئی تحریف اس میں ہوگی بلکہ وہ ہمیشہ نافذ و رائج رہے گا، اس لئے اس کی " آیتوں " اور " پورے قرآن " ہی کو " مُحْكَمٌ " کہا گیا، یعنی اپنی جگہ سے نہ ٹلنے والا۔ خود اپنے آپ میں مضبوط و غیر محتاج۔

" اُمُّ الْكِتٰبِ " اس کی صفت اس لئے قرار دی گئی کہ ننھی ننھی پچیاں ہی، آہستہ آہستہ بڑھ کر " مائیں " بنتی ہیں " اُمّ " کے معنی " ماں " کے ہیں۔ انسانیت جب تک کمسن تھی ہر ارتقاء پر، ان کے لئے ابتدائی نئی کتابیں آیا کیں، تا آنکہ جب انسانیت سن شعور و بلوغ کو پہونچ گئی تو سب کتابوں کی تعلیمات کو سمیٹ کر انھیں اپنی گود میں لئے ہوئے یہ آخری کتاب (قرآن) آئی۔ اس لئے قرآن کو " اُمُّ الْكِتٰبِ " کہا گیا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح خدا کے علم کے پاس وہ " اُمُّ الْكِتٰبِ " ہے، جس میں سارے الہامی صحائف موجود ہیں :۔

وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا " اور وہ ہمارے پاس اُمّ الکتب میں

لَعَلِیٌّ حَکِیْمٌ ۔ (زخرف ۱) بڑے ہی رتبے کی پُر از حکمت کتاب ہے"
"آیات" ہی کے مجموعے کا نام "قرآن" ہے۔ "قرآن" الگ اور اُس کی
"آیات" الگ نہیں۔ اس لئے "آیات" یا "سورہ" یا "پورے قرآن"
میں کوئی فرق نہیں اور اِس طور پر "پورا قرآن" "مُحْکَمْ" ہے، اسی لئے
سورۂ آل عمران میں "آیات" کو "مُحْکَمْ" کہا ہے، سورۂ محمدؐ میں "سورہ"
کو "مُحْکَمْ" کہا ہے:۔

فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْکَمَةٌ (محمدؐ ۳) "سو جب کوئی محکم سورہ نازل ہوتی ہے"
اور پھر سُورۂ ھود میں "پوری کتاب" ہی کو "مُحْکَمْ" کہا ہے، اس طور پر
قرآن کی ہر آیت اور ہر سُورہ اور پورا قرآن "مُحْکَمْ" ہے، اٹل ہے اپنی
جگہ سے نہ ہلنے والا ہے۔

"مُتَشَابِہ"

اللہ تعالیٰ صرف مومنوں ہی کو مخاطب نہیں کر رہا تھا کہ "محکم" کا ذکر کر کے بات ختم
کر دی جاتی بلکہ وہ یہود و نصاریٰ وغیرہ کو بھی سمیٹنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اہلِ کتاب کی جھجک دور کرنے کے،
لئے جس طرح یہ کہا کہ قرآن "تورٰۃ و انجیل کا "مصدّق" ہی نہیں بلکہ اُن پر "مہیمن" بھی ہے (مائدہ)
اسی طرح انہیں یہ بھی بتایا کہ یہ قرآن کوئی عجوبہ اور غیر معروف کتاب نہیں بلکہ تورٰۃ و انجیل وغیرہ سے ملتی جلتی
(متشابہ) اور بار بار دہرائی گئی (مثانی) کتاب ہے۔ "مُتَشَابِہ" کے معنی ہیں مماثل ہونا
یکساں ہونا، مانند ہونا، ہمشکل ہونا، ایک طرح کا سا ہونا، ملتا جلتا ہونا۔ مشابہت،
دو متفرق چیزوں کے باہم ملتے جلتے ہونے پر بولا جاتا ہے، ایک ہی چیز کے اندر
کی دو چیزوں کو باہم مُتَشَابِہ نہیں بولا جاتا۔ انسان کے دائیں ہاتھ کو بائیں کے مُتَشَابِہ

نہیں بولتے ۔ البتہ ایک کی شکل، دوسرے شخص کی شکل سے ملنے پر کہتے ہیں کہ فلاں فلاں میں بڑی مشابہت ہے ۔ "منکرینِ قرآن" کے ذکر میں ہے کہ :-

قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا جو بے علم ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے کلام
يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ط کیوں نہیں کرتا ہے یا ہمارے پاس کوئی اور ہی
كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ دلیل بھیجے، اسی طرح کی باتیں وہ لوگ بھی
مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ کہتے چلے آئے جو ان سے پہلے ہو گذرے ہیں،
(بقرہ ۱۴) در اصل اُن سب کے قلوب ایک دوسرے
سے بہت ملتے جلتے ہیں ۔"

غور فرمایئے "اگلے منکرینِ وحیِ رسالت" کے "قلوب" کو "منکرینِ محمدؐ و قرآن" سے "مشابہ" اور "ملتا جلتا" بیان کیا گیا ہے ۔ یہ الگ الگ قومیں یا جماعتیں تھیں یہ جدا جدا افراد تھے جن کے قلوب کو باہم "متشابہ" کہا گیا ہے ۔ اور سنیئے :-

فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ (رعد ۲) "پھر دونوں کی تخلیق اُن کو ملتی جلتی معلوم ہوئی ؟"

یہاں بھی دو مختلف خالق کی تخلیق کے ذکر میں لفظ "تَشَابَهَ" آیا ہے ۔ قرآن مجید کو "مُتَشَابِہ" اس معنی میں کہا گیا ہے، کہ وہ اپنے سے پہلے والی کتابوں سے، بہ لحاظ تعلیمات، اصولی طور پر ملتا جلتا ہے ۔ یعنی جس طرح کی تعلیمات، "اگلی کتابوں" کی تھیں، اسی طرح کی تعلیمات "قرآن" کی بھی ہیں، اس لئے "قرآن" تورۃ و انجیل سے "مُتَشَابِہ" ہے ۔ ملتا جلتا ہے ۔ اور اسی لئے اس "مُتَشَابِہ" کی دوسری تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ بار بار دہرائی گئی ہے ۔ "مُتَشَابِہ" ہرگز "مُحْكَم" کی ضد نہیں بلکہ "قرآن" کی دوسری صفت ہے

کیونکہ وہ اصولی طور پر بہ لحاظ تعلیمات توراۃ وانجیل سے ملتا جلتا ہے ـــــ یوں تو یہ بات کہ قرآن کی تعلیمات واقعی اگلی کتابوں کی تعلیمات سے ملتی جلتی ہیں یا نہیں؟ مطالعہ ہی سے جانچی جاسکتی ہے۔ مگر میں، اطمینان کے لئے یہاں چند طرح کی مماثلت ومشابہت کا ذکر کر دیتا ہوں۔

(الف)

ایک طرح کی مماثلت تو خود قرآن ہی ظاہر کرتا ہے اور اس کا دعویٰ ہی دلیل بھی ہے جس کے لئے مثال کی ضرورت نہیں۔ مثلاً قرآن کہتا ہے کہ فلاں بات جو "قرآن" میں ہے، وہی بات "توراۃ" و "انجیل" میں بھی مذکور تھی، ظاہر ہے کہ اس دعویٰ کے لئے ثبوت کی ضرورت نہیں۔ جیسے "قرآن" کہتا ہے کہ ان مومنوں کی "جان" کو اللہ تعالےٰ نے "جنت" کے عوض خرید لیا ہے، جو جہاد میں خدا کے لئے لڑتے ہیں۔ اس کے بعد ہے :۔

وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ "اس بات پر سچا وعدہ کیا گیا توراۃ میں بھی
وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ (توبہ ۱۴) انجیل میں بھی اور قرآن میں بھی ۔"

ظاہر ہے کہ مومنوں کو اس دعویٰ میں کوئی شک نہیں لہذا اس کا ثبوت بہم پہونچانے کی ضرورت نہیں یا "قرآن" کہتا ہے، کہ مومنوں کی پیشانیوں سے اثر سجدہ ظاہر ہوتے ہیں، قرآن اپنے اندر کی اس خصوصیت کے ذکر کے بعد کہتا ہے :۔

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ "ایسوں کی یہ صفات توراۃ میں بھی مذکور
فِي الْإِنْجِيلِ ۔ (فتح ۴) تھیں اور انجیل میں بھی ـــ "

(ب)

ایک قسم مماثلت کی یہ ہے، کہ قرآن بعض خاص چیزوں کا ذکر کرتا ہے کہ ایسا ہی فلاں جگہ بھی تھا، سو اسکو دیکھا جائے کہ کیا واقعی ایسا ہے؟ مثلاً" قرآن کہتا ہے کہ بنی اسرائیل پر :-

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ "اور ہم نے اُن پر اس میں یہ فرض کیا تھا
بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے
وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان
بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ کے بدلے کان اور دانت کے بدلے
وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ـ دانت اور خاص زخموں کا قصاص
(مائدہ ۷) لیا جائے گا ـ"

چنانچہ توراۃ کتاب احبار باب ۲۴ آیات ۱۹ تا ۲۱ میں ہے کہ :-

" اگر کوئی شخص اپنے ہمسایہ کو عیب دار بنائے تو جیسا اُس نے کیا ویسا ہی اُس سے کیا جائے، عضو توڑنے کے بدلے عضو توڑنا ہو، اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، جیسا عیب اُس نے دوسرے آدمی میں پیدا کر دیا ہے ویسا ہی اُس میں بھی کر دیا جائے ـ"

یا مثلاً قرآن میں ذکر کیا گیا ہے کہ یہود پر تمام ناخن والے جانور اور گائے اور بکری میں سے ان کی چربیاں حرام تھیں :-

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا " اور یہود پر ہم نے تمام ناخن والے

كُلَّ ذِي ظُفُرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ — "جانور حرام کر دیے تھے اور گائے اور
وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَ — بکری کی چربیاں بھی ہم نے ان پر حرام
هُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُ — کر دی تھیں، سوائے اس کے جو اُن کی
هُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا — پشت پر یا آنتوں میں لگی ہو یا جو ہڈی سے
اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۔ (انعام ۱۸) — ملی اور سٹی ہوئی ہو ۔"

توراۃ کتاب احبار باب ۳ آیات ۴ و ۵ میں ہے :۔

"اور سلامتی کے ذبیحہ میں سے خداوند کے لئے آتشیں قربانی گزرانے یعنی جس چربی سے انتڑیاں ڈھکی رہتی ہیں اور وہ ساری چربی جو انتڑیوں پر لپٹی رہتی ہے ۔ اور دونوں گردے اور اُن کے اوپر کی چربی، جو کمر کے پاس رہتی ہے ۔ اور جگر پر کی جھلی گردوں سمیت ان سبھوں کو وہ جدا کرے ۔"

اور پورے باب ۱۱ آیات ۱ تا ۴۷ میں اُن جانوروں کی تفصیلی فہرست مذکور ہے جن کا کھانا حلال یا حرام بتایا گیا ہے ۔

(ج)

ایک طرح کی مماثلت یہ بھی ہے کہ جو ذکر یا بیان یا حکم خاص "قرآن" میں ہو، وہی ذکر، بیان یا حکم دوسرے صحیفہ میں بھی پایا جائے[1] ۔ اس طور پر بھی معلوم ہوگا کہ "قرآن" اگلے صحائف سے "مُتشابہ" ہے مثلاً قرآن میں ہے :۔

---

[1] اس کتاب کے آخری مقالہ میں بھی "قرآن" اور "توراۃ" کی ایسی "مُتشابہ" آیات اور بھی ملینگی

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا ، اور جب ناپو تو پورا ناپو اور جب تولو
بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ۔ تو صحیح ترازو سے تول کے دو ۔۔۔ "
(بنی اسرائیل ۴)

توراۃ کتاب احبار باب ۲۰ آیت ۳۵ و ۳۶ میں ہے :۔

" تم انصاف اور پیمائش اور وزن اور پیمانہ میں ناراستی نہ کرنا ٹھیک ترازو ، ٹھیک باٹ ، پورا ایفہ اور پورا ہین رکھنا ۔۔۔ "

یا مثلاً قرآن میں ہے :۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ " تم پر حرام کیے گئے ہیں مردار اور
وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ خون اور سور کا گوشت اور وہ جو
وَمَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ (مائدہ ۱) غیر اللہ کے نام سے نامزد کیا جائے ۔

توراۃ کتاب احبار باب ۱۱ آیت ۷ میں ہے :۔

" اور سور کو ، کیونکہ اس کے پاؤں الگ اور چرے ہوتے ہیں پر وہ جگالی نہیں کرتا وہ بھی تمہارے لئے ناپاک ہے ۔ "

اور باب ۱۷ آیات ۱۵ و ۱۶ میں ہے :۔

" تم کسی قسم کے جانور کا خون نہ کھانا کیونکہ ہر جانور کی جان اس کا خون ہی ہے ۔ جو کوئی اسے کھائے وہ کاٹ ڈالا جائے گا اور جو شخص مردار کو یا درندہ کے پھاڑے ہوئے جانور کو کھائے وہ خواہ دیسی ہو یا پردیسی ، اپنے کپڑے دھوئے اور پانی سے غسل کرے اور شام تک ناپاک رہے ، تب وہ پاک ہوگا ۔۔۔ "

یہ چند مثالیں محض یہ دکھانے کیلئے پیش کی گئی ہیں کہ محرّف ہونے کے باوجود قرآن کی بعض تعلیمات اب بھی اگلے صحائف سے ملتی جلتی ہیں۔ اور قرآنی آیات یا پوری کتاب کو "متشابہ" صرف اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ وہ پہلے کی کتابوں سے ملتی جلتی ہے۔ "مُتَشَابِہ" کے معنی ہی ملتے جلتے ہونے کے ہیں، چنانچہ "جنتیوں" کے ذکر میں ہے کہ :-

كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوا هٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا (بقرہ ۳)

"جب کبھی بہشتیوں میں سے کسی پھل کی غذا ان کو دیجائیگی تو وہ دیکھتے ہی کہہ اٹھیں گے کہ اے یہ تو وہی ہے جو ہم کو اس سے پہلے ملا تھا ——— اور واقعی ملے گا بھی ان کو دونوں بار کا پھل ملتا جلتا ہی"۔

ان "پھلوں" کو "مُتَشَابِہ" کیوں کہا گیا؟ اس لئے کہ "جنّت" بھی دو دو ہے اور وہاں "پھل" اور "میوے" بھی دو دو قسم کے ہوں گے سورہ رحمٰن میں اس مسئلہ کو صاف کر دیا گیا ہے :-

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ (رحمٰن ۳)

"اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا، اس کے لئے دوہری جنت ہی"

فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجَانِ (رحمٰن ۳)

"ان دونوں باغوں میں، ہر میوے کی دو دو قسمیں ہوں گی۔"

چونکہ یہ دونوں پھل ملتے جلتے ہوں گے اس لئے ان "پھلوں" کو "مُتَشَابِہ" کہا گیا ہے۔ "قرآن" بھی، جن کتابوں کی تصدیق کرتا تھا، ان سے ملتا جلتا تھا

اِس لئے اُس کی ایک صفت "مُتشابہ" بھی کی گئی، دنیاوی نعمتوں کے ذکر میں ہے :-

(۱) وَجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ " اور انگوروں کے باغات اور زیتون اور وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ، انار جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہوتے ہیں اور نہیں بھی ملتے جلتے "۔ (انعام ۱۲)

(۲) وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ " اور کھیتی جسمیں مختلف طور کی کھانے کی چیزیں پیدا وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ہوتی ہیں اور زیتون اور انار وغیرہ جو باہم ایکدوسرے سے ملتے جلتے بھی ہوتے ہیں اور نہیں بھی ملتے جلتے "۔ (انعام ۱۷)

بالکل اسی معنی میں لفظ "متشابہ" سورہ آل عمران والی آیت میں بھی آیا ہے، مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ قرآن، توریۃ و انجیل سے ملتی جلتی ہوئی (متشابہ) کتاب ہے اور قرآن کو چھوڑ کر قرآن سے ملتی جلتی ہوئی کتابوں مَا تَشَابَهَ مِنْهُ کا جو لوگ اتباع کرتے ہیں ان کے دلوں میں کجی ہے، صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ (رعد)، مُخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ (حج ۱) مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ (انعام) والا انداز بیان سورہ آل عمران والی آیتوں میں اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا، اگر مُحْكَمٰتٌ وَّغَيْرُ مُحْكَمٰتٍ کہا جاتا تو یہ غلط ہو جاتا کیونکہ قرآن کی کوئی آیت "غیر محکم" نہیں ہے، "محکم" کے معنی ہی ہیں۔ "خود اپنے آپ میں مضبوط" اسی طرح مُتَشٰبِهٰتٌ وَّغَيْرُ مُتَشٰبِهٰتٍ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا، کیوں کہ قرآنی آیات کو محکم، رکھتے ہوئے دوسری آسمانی کتابوں سے "متشابہ" بتانا مقصود تھا، اور کسی طرح بھی یہ مفہوم مُتَشٰبِهٰتٌ وَّغَيْرُ مُتَشٰبِهٰتٍ - کہنے سے پورا نہیں ہوتا اسی لئے مُحْكَمٰتٌ ...... وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ کہا گیا، یعنی اولاً محکم ثانیاً "متشابہ" اور اس مفہوم کو کہ قرآن بلحاظِ تعلیمات اگلی کتابوں سے ملتا جلتا ہے، بار بار مختلف طریقوں سے قرآن میں ظاہر کیا گیا :-

(۱) اِنَّہٗ لَفِی زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ۔ (شعرا ۱۱) "یہی کچھ تو اگلی کتابوں میں بھی تھا۔"

(۲) اِنَّ ھٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی (اعلیٰ) "بلا شبہ یہی سب اگلے صحائف میں بھی تھا۔"

(۳) کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ (زمر) "یہ وہ کتاب ہے جو اگلی کتابوں سے ملتی جلتی ہے بار بار دہرائی گئی ہے۔"

(۴) مَا یُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِیْلَ " اے رسول! تم سے بھی وہی باتیں کہی جاتی ہیں
لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ (حم سجدہ ۵) جو تم سے پہلے کے رسولوں سے کہی گئی تھیں"

چونکہ رسول اللہ اور مسلمانوں کو یہ علم مشکل تھا کہ "توراۃ" و "انجیل" کا کون سا جزء اور حکم محرّف ہے ۔ اور کون سا اصلی؟ نیز "قرآن" ان کتابوں پر مہیمن تھا ہی، اس لئے مسلمانوں کو "قرآن" ہی کے "اتباع" کا حکم تھا، مگر یہود و نصاریٰ خود اپنی کتابوں کی حالت سے واقف تھے، اور "ھُمْ یَعْلَمُوْنَ" سے ظاہر ہے کہ وہ جانتے تھے کہ کس قدر حصہ اُن کا اصلی اور کتنا تحریفی ہے، لہٰذا دونوں کو حکم تھا کہ وہ لوگ اپنے اپنے معاملات میں اپنی اپنی کتابوں سے ہی فیصلے کیا کریں ۔ یہود کے بارے میں ہے :-

(۱) کَیْفَ یُحَکِّمُوْنَكَ وَعِنْدَھُمُ "وہ تم سے کیوں فیصلہ کراتے ہیں؟
التَّوْرٰىةُ فِیْهَا حُکْمُ اللّٰهِ ۔ ان کے پاس توراۃ تو ہے ہی جس میں اللہ کے احکام موجود ہیں ۔" (مائدہ ۶)

(۲) وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ " اور جو اللہ کے نازل کئے ہوئے
فَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (مائدہ) کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ کافر ہیں"

اور عیسائیوں کے بارے میں ہے :-

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ "اور انجیل والے اُس کے مطابق فیصلے
اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ کریں جو انجیل میں اللہ نے نازل کیا ہے
بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ اور جو اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلے
هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (مائدہ ۷) نہیں کرتے وہ فاسق ہیں ۔"

اگر یہود ونصاریٰ کی ان کتابوں میں کچھ حصّہ محرّف اور کچھ اصلی نہ ہوتا تو دونوں جگہ "بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ" کی تخصیص وتاکید ہرگز نہ کی جاتی ۔ یعنی وہ اپنے معاملات کے فیصلے کریں مگر اُسی حصّہ کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے اُس کے مطابق نہیں جو انھوں نے خود تحریف کرکے بڑھا گھٹا لیا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُن کا کچھ حصّہ "تحریفی" تھا تو کچھ حصّہ "اصلی" بھی تھا ۔ پھر یوں بھی "قرآن" اُن صحائف کی یکسر تکذیب نہیں کرتا ہے :۔

(۱) وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ "اور جب اُن کے پاس اللہ کیطرف سے وہ کتاب
مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ (بقرہ ۱۱) آئی جو اُن کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو انکے پاس ہیں۔"
(۲) هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ "وہ قرآن سچا ہے جو اُن کتابوں کا مصدق
(بقرہ ۱۱) ہے جو ان کے پاس ہیں ۔"

ظاہر ہے کہ قرآن، اُن کتابوں کی مطلقاً تکذیب نہیں کررہا ہے جو اُن لوگوں کے پاس اُس وقت تھیں ۔ بلکہ سچ پوچھئے تو، اسی سورہ آلِ عمران میں زیرِ بحث آیتوں سے پہلے والی آیت، توراۃ و انجیل سے کلّیتاً انکار کو "کفر" قرار دیتی ہے :۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ "اللہ نے وہ کتاب تم پر سچائی کیساتھ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ اُتاری ہے جو اپنے سے پہلی والی کتابونکی

وَاَنْزَلَ التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ تصدیق کرتی ہے اور اس سے پہلے ہم نے
مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ لوگوں کی ہدایت کیلئے توراۃ و انجیل بھیجا تھا
الْفُرْقَانَ ، اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اور فرقان نازل کیا بیشک جو لوگ اللہ کی آیات
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ کے منکر ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے "
(آل عمران ۱)

توراۃ ، انجیل اور فرقان ، جب سب ہی " آیات اللہ " ہیں اور اُن کا انکار کرنے والوں کے لئے " عذاب شدید " کی وعید ہے ، تو کیا اس کا صاف مطلب یہ نہیں کہ ان کتابوں میں بھی اصلیت ہے ضرور اور وہ پُوری کی پُوری محرف نہیں ہوئی ہیں؟ مگر چونکہ وہ کتابیں کچھ " اصلیت " کی بھی حامل تھیں اور کچھ " تحریف " کا بھی شکار ، اسی لئے قرآن نے مسلمانوں پر اُن کے " اتباع " کو ممنوع قرار دیا ، اور اسی لئے " قرآن " کو اُن سے " ملتا جلتا " اور " مُتَشَابِہ " کہا۔
اور سورۃ آل عمران والی آیت میں مسلمانوں کو باخبر ، متنبہ اور مطلع کیا گیا کہ دیکھو یہاں بہت سے صحائف تمہارے سامنے " الہامی صحیفے " کہہ کر پیش ہوں گے مگر وہ سب وقتی تھے اور وہ تمام تر اصلی نہیں رہے بلکہ محرف ہوگئے اس لئے اب وہ تمہارے لئے ہدایت کا سرچشمہ نہیں بن سکتے ۔ " قرآن " میں " اگلی کتابوں " کی تصدیق دیکھ کر تم لوگ یہ دھوکا نہ کھانا ، کہ یہی کتابیں وہ تمام تر اصلی کتابیں ہیں جن کی " قرآن " تصدیق کرتا ہے جس حد تک کہ " اتباع " کا تعلق ہے تم صرف " قرآن " ہی کی پیروی کرو ، البتہ چونکہ اُن میں بھی کچھ اصلی باتیں ہیں لہذا جس حد تک " ایمان کا تعلق ہے " یہ ضرور ایمان رکھو کہ وہ کتابیں بھی ، جن کی قرآن تصدیق کرتا ہے ، اسی اللہ کی

نازل کی ہوئی تھیں اور ہیں جس نے "قرآن" نازل کیا ہے۔ جو لوگ "محکم قرآن" پر پکا ایمان نہیں رکھتے ہیں اُن کے دل ہی ٹیڑھے ہیں، اسی لیے وہ اُن ہی کتابوں کی پیروی کرتے یا کرنا چاہتے ہیں۔ جو "قرآن" سے ملتی جلتی ہیں اور تاویلیں کرتے ہیں، یا تو فتنہ پردازی کے لئے یا تلاشِ حقیقت اور نیتجہ کی جستجو کے لئے۔ سو نیتجہ کی جستجو تو فضول ہی ہے اس کو تو صرف اللہ ہی جانتا ہے، لہٰذا جو "راسخ العلم" ہیں وہ "قرآن" سے ملتی جلتی کتابوں کے پیچھے نہیں پڑتے، بلکہ وہ یہ کہہ کر نکل جاتے ہیں کہ ہم ان پر بھی ایمان رکھتے ہیں کیونکہ وہ بھی ہمارے پروردگار ہی کی طرف سے نازل ہوئی تھیں —— اب آیئے! اس تحریر کی روشنی میں پھر اِس زیرِ بحث آیت کو، اُس کی تفسیر کے ساتھ دیکھ اور پڑھ لیجیے:۔

هُوَ الَّذِیٓ اَنزَلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ

(وہ اللہ ایسا ہے جس نے تم پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے کہ اسمیں محکم آیات ہیں)

اے رسول! ہم نے تم پر جو کتاب نازل کی ہے وہ حرفِ آخر ہے، اب اُس میں کوئی ردّوبدل نہ ہوگا۔ یہ لفظ، معنی، قانون، نفاذ ہر حیثیت میں محکم ہے، اٹل ہے اپنی جگہ سے ہلنے والی نہیں ہے۔ کسی اور کتاب کی محتاج نہیں ہے۔

هُنَّ اُمُّ الۡکِتٰبِ (اور وہی آیات —— اُمُّ الکِتٰب ہیں)

اس سے پہلے بہت سی کتابیں ہوئی ہیں سب کی تعلیمات کو، اصولی طور پر اس قرآن نے اپنی آیات میں اس طرح سمیٹ لیا ہے جس طرح —— ایک مرغی اپنے تمام بچوں کو اس طرح اپنے پردوں میں سمیٹ کر بیٹھ جاتی ہے کہ اگر دھت کر کے اُن کو بکھیر نہ دیا جائے تو معلوم ہوتی ہے کہ بس تنہا ایک مرغی بیٹھی

ہوئی ہے۔ قرآن نے تمام کتابوں کو ایک مشفق ماں کی طرح اپنی گود میں سمیٹ لیا ہے۔

وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ط (اور دوسری وہ ہیں جو متشابہ ہیں)

کچھ آیتیں اس قرآن کی تم کو ایسی ملیں گی جو اپنے سے پہلے والی کتابوں سے ملتی جلتی ہیں، وہ باہم متشابہ نظر آئیں گی۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ

(سو جنکے دلوں میں کجی ہے وہ تو اُن ہی کا اتّباع کرتے ہیں جو قرآن سے ملتی جلتی کتابیں ہیں)

اور ہاں دیکھو! جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ قرآن کی پیروی نہیں کرتے، اور وہ نہیں محرّف کتابوں کی طرف استقامت کے ساتھ جھکے ہوئے ہیں اور وہ انہیں کتابوں کا اتّباع کرتے ہیں جو قرآن سے کسی حد تک ملتی جلتی ہیں "زیغ" کا صحیح مفہوم ہے استقامت کیساتھ ایکطرف جھکے رہنا ٹیڑھے ہی رہنا فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (الصّفّ ۵) "سو جب وہ ٹیڑھے رہے تو اللہ نے اُنکے دلوں کو اور بھی ٹیڑھا کردیا"۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (النجم ۱۷) "نہ تو اس کی نگاہ ٹیڑھی ہوئی اور نہ وہ حد سے نکلا"،

ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ

(فتنہ انگیزی کیلئے اور نتیجہ کی جستجو کے لئے حالانکہ نتیجہ کی جستجو فضول ہے وہ صرف اللہ جانتا ہے)

وہ ایسا فتنہ انگیزی کے لئے کرتے ہیں اور نتیجہ کی تلاش میں، حالانکہ یہ کوشش مہمل ہے، اس کے نتیجے کو تو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا

ہاں البتہ جو لوگ قرآن پر ایمان کامل رکھتے ہیں اور یہ تحقیقی طور پر جانتے ہیں کہ وہ کتابیں جو قرآن سے ملتی جلتی ہیں، بجنسہٖ اپنی اصل شکل و صورت میں باقی نہیں

ہیں، وہ دھوکا نہیں کھاتے، وہ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں، اُسی کا اتباع کرتے ہیں اور باقی کتابوں کے متعلّق یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہاں ہم اُن پر بھی ایمان رکھتے ہیں، کیونکہ سب ہی کتابیں ہمارے اُسی پروردگار کی طرف سے نازل شدہ تھیں جس نے ہم کو قرآن عطا کیا ہے۔ بس ہم اس سے زیادہ اُن کے متعلّق کچھ نہیں کہتے۔

وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ

(اور نصیحت تو عقلمند ہی قبول کرتے ہیں)

ہم نے تم کو سب سمجھا دیا، بتا دیا، اب یہ نہ کہنا کہ ہم کو کسی نے بتایا نہیں، ہم نے اُن کتابوں کی تصدیق قرآن میں دیکھا، اور پھر اُن کو قرآن سے ملتا جلتا پایا تو ہم نے سمجھا کہ اُن کتابوں کے اتّباع میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ تم یہ باتیں خوب سمجھ لو، اور اگر عقلمند ہو تو نصیحت حاصل کر لو۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً، إِنَّكَ أَنتَ الْوَهَّابُ۔

جو لوگ نصیحت کو قبول کر لینے والے ہیں، اس حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں۔ اس عظیم دھوکے کو جان لیتے ہیں، وہ قرآن ہی پر ڈٹ جاتے ہیں اور اُسی کا اتباع کرتے ہیں۔ اور ہر وقت اپنے پروردگار سے یہ دعاء کرتے رہتے ہیں کہ :-

"اے ہمارے پروردگار! ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو زیغ اور کجی سے بچانا اور ہم کو اپنے پاس سے خاص رحمت عطا فرمانا، بیشک تو بڑا ہی دینے والا ہے۔"

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (اعراف ۲۲)
(سو تم یہ قصہ بیان تو کردو، شاید کہ لوگ اس میں کچھ غور و فکر کریں)

"فَتَنَّا" و "اَلْقَيْنَا"

(حضرت سلیمانؑ کے قصّہ میں)

مشامِ تیز سے، ملتا ہے صحرا میں نشاں، اُس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں، آہوئے تاتاری

اقبال

حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک "آزمائش" ہوئی اور وہ یہ کہ ان کی کرسی پر ایک جسم لا ڈالا گیا، یہ آزمائش کیا تھی؟ اور ان کی کرسی پر کیا لا ڈالا گیا؟۔

اس مقالہ میں اسی موضوع کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

"فتنّا" و "القینا"

"بنی اسرائیل" نے جب وادیٔ سینا سے نکل کر، اپنے بادشاہ "طالوت" کی قیادت میں، فلسطین پہونچ کر "جالوت" کے لشکر کا مقابلہ کیا تو وہاں کا بادشاہ "جالوت" حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ سے مارا گیا، اور اس طور پر حضرت داؤدؑ طالوت کے جانشین قرار پائے :۔

(۱) وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَاٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ "اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اس کو سلطنت و حکمت عطا کی اور بھی جو کچھ چاہا اس کو سکھایا ۔" (بقرہ ۳۳)

(۲) يٰدَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً[1] فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ۔ "اے داؤدؑ! ہم نے تم کو اس زمین پر حاکم بنایا ہے سو تم، لوگوں کے معاملات میں حق و صداقت سے حکم دیا کرنا ۔" (صٓ ۲)

---

[1] جو لوگ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً سے سمجھتے ہیں کہ "آدم" کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنا "نائب" بنایا تھا وہ غور کریں کہ داؤدؑ کے بارے میں کیا کہا گیا ہے ؟ ۔ دونوں جگہ "خلیفۂ ارضی" بنانے کا ذکر ہے جسکے معنیٰ "زمین پر حاکم" بنانے کے ہیں "آدم" کو "خلیفۃ اللہ" نہیں "خلیفۃ الارض" کہا گیا ہے، "خلیفہ" کے معنیٰ "حاکم" کے ہیں "آدم" "خدا کے "نائب" نہیں بلکہ زمین کے حاکم بنائے گئے تھے قرآن نے لفظ "خلیفہ" کو "حاکم" کے معنیٰ میں ہر جگہ استعمال کیا ہے ۔"

جب حضرت داؤدؑ کا انتقال ہوگیا تو فلسطین کی یہ حکومت "وراثتاً"، انکے بیٹے حضرت سلیمانؑ کو ملی :-

وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاؤدَ " اور داؤدؑ کے وارث سلیمانؑ ہوئے[1]۔"
(نمل ۲)

حضرت سلیمانؑ یوں تو آخر میں بڑے کرّ و فر کے بادشاہ ہوئے، مگر دورانِ حکومت میں، قرآن کہتا ہے کہ وہ ایک "آزمائش" میں پڑے تھے، یہ "آزمائش" کیا تھی؟ اس کے چہرے سے ہنوز نقاب دُور نہیں ہوا ہے، قرآن کا متذکرہ مقام یہ ہے :-

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ وَاَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّہٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ٥ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ هَبْ لِیْ مُلْکًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ٥ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّیْحَ تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖ

" اور ہم نے سلیمان کو آزمائش میں ڈالا تھا، اور ہم نے ان کی کرسئ حکومت پر ایک جسد کو لا ڈالا تھا سو اُس نے رجوع کیا پھر کہنے لگا کہ " اے میرے پروردگار! مجھے ایسی حکومت عطا کر کہ میرے سوا کسی کو ایسی حکومت نہ ملی ہو، تو بڑا دینے والا ہے۔"

---

[1] جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ " نبی " کا کوئی "وارث" نہیں ہوتا وہ اس آیت پر غور کریں کہ حضرت داؤدؑ " نبی " تھے اور اُن کی ساری چیزیں یہاں تک کہ " حکومت " بھی " وراثتاً " اُن کے بیٹے سلیمانؑ کو ملی۔ بقول علامہ آزاد " قرآن " اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا، بلکہ اس کے مخالف کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی "۔ "سلیمان کو " نبوت " تو وراثتاً ملی نہیں، باقی چیزیں اُن کو شخصی حیثیت سے وراثتاً ملیں۔

رُخَآءً حَيۡثُ اَصَابَ ۝ وَالشَّيٰطِيۡنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ۔
سوم نے ہوا کو اُسکے تابع کردیا جو اُس کے حکم سے جہاں وہ چاہتا تھا نرمی سے چلتی تھی اور شیاطین کو بھی اُسکے تابع کردیا تھا جو فن تعمیر اور غوطہ خوری کے ماہر تھے "

(ص ۳)

"آزمائش" کا ذکر صرف اسی قدر ہے کہ " ان کی کرسئی حکومت پر ایک جسد کو لا ڈالا تھا" بس۔

قدیم مفسرین نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے وہ چار صورتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ ایک گروہ نے یہ کہہ کے خاموشی اختیار کی ہے کہ جب قرآن نے اسکو واضح نہیں کیا ہے تو ہمیں بھی خاموش ہی رہنا چاہئے ۔ شاید ان بزرگوں کے نزدیک یہ " علمی مسئلہ " نہیں بلکہ " ایمانی مسئلہ " تھا ورنہ ظاہر ہے کہ تحقیق و تدقیق کے علمی مسئلہ میں کچھ بولنا " کفر " نہیں ہے ۔ چاہے آگے چل کر وہ تحقیق سے غلط ہی کیوں نہ ثابت ہو جائے ، کتنے مسئلے ہیں جن پر قدماء کے یہاں رائے ظاہر کی گئی تھی مگر وہ اس وقت غلط ثابت ہو چکی ہیں ۔

دوسرا گروہ، وہ ہے جس نے " صحیح بخاری " کی ایک غیر متعلق " روایت " کو اس واقعہ والی آیت سے چپکا دیا ہے ، جس میں مذکور ہے کہ حضرت سلیمانؑ ایک رات اپنی نشتر[۱] بیویوں کے پاس اس ارادہ سے گئے تھے کہ سب کو " حمل " رہے گا ، اور ان سب سے نشتر " مجاہد " پیدا ہوں گے ، مگر چونکہ انھوں نے ایسا کہتے اور سوچتے وقت " انشاء اللہ " نہیں کہا تھا اس لئے اُن کو ناکامی و محرومی ہوئی ، صرف ایک بیوی کو ایک " ناقص بچہ " پیدا ہوا ۔ " روایت " تو اتنی ہی ہے

---

[۱] توراۃ نے ان کی ایک ہزار بیویاں ہونا بیان کیا ہے سات سو شاہزادیاں اور تین سو حرمیں (سلاطین اول باب ۱۱ آیات ۳)۔

مگر اِس میں اتنا اضافہ کرکے کہ، اُسی ناقص بچے کو ایک خادم نے لاکر حضرت سلیمانؑ کے سامنے تخت پر ڈال دیا تھا، اِس "روایت" کو یہاں قرآنی آیت پر چپکا دیا گیا ہے۔ اوّل تو یہ "روایت" ہی ناقابلِ اعتبار ہے، کیونکہ جو کچھ اس میں ہے وہ ایک "انسان" سے "محال" اور "پیغمبر" کی شان کے "منافی" ہے، دوسرے اُس "روایت" میں "اس ناقص بچے" کو "تختِ سلیمانی" پر لا ڈالنے کا کوئی ذکر نہیں ہے، تیسرے یہ کوئی "آزمائش" نہیں ہوئی جس کا تعلق "حکومت کی کرسی" سے ہو۔ چوتھے اس "آزمائش" کے بعد حضرت سلیمانؑ نے جو دُعا کی ہے اُس کا اس واقعہ سے کوئی تعلّق معلوم نہیں ہوتا۔

تیسرا گروہ، وہ ہے جس نے اس سلسلے میں اُن لغو و لایعنی باتوں کو قبول کر کے اُس سے متعلّق کر دیا ہے۔ جن کی کوئی سند نہیں، یعنی یہ کہ حضرت سلیمانؑ کی انگشتریِ حکومت گُم ہوگئی اور پھر مچھلی کے پیٹ سے برآمد ہوئی وغیرہ

چوتھا گروہ، وہ ہے جو "آزمائش" سے حضرت سلیمانؑ کی علالت "القاءِ جسد" سے اُن کا شدّتِ مرض میں، جسدِ بے رُوح کی طرح تختِ حکومت پر بیٹھنا، اور "ثُمَّ اَنَابَ" سے اُن کا صحت یاب ہونا مراد لیتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے یہ تاویل اس لئے قبول کر لی کہ خود کسی فیصلے پر نہیں پہونچ سکے تھے حالانکہ یہ تفسیر و تاویل بھی بے معنی ہے۔ کیونکہ حضرت سلیمانؑ علالت سے صحت یابی کے بعد "صحتِ دَوام" کی دعاء کرتے نہ کہ استحکامِ سلطنت اور بے مثل حکومت کی؟۔

دورِ حاضر کے محقّقین و مفسّرین کے یہاں بھی اس عنوان پر کوئی رائے نہیں

ملتی ہے ، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ علامہ ابوالکلام آزاد سے لے کر علامہ آزاد سُبحانی تک کی تقریباً تمام تفسیریں ابھی نامکمّل ہیں اور وہ "سورۃ ص" تک پہونچے ہی نہیں کہ اس موضوع پر اُن کی رائے عوام کو معلوم ہو۔

علاّمہ پرویز نے "معارف القرآن" کو بالکل نئے انداز سے پیش کیا ہے اس لئے اُس کی تیسری جلد میں ، حضرت سلیمانؑ کے ذکر میں ، اُن کی رائے سامنے آگئی ہے ، اُنھوں نے "القاء جسد" سے مُراد حضرت سلیمانؑ کا وارث اور بیٹا لیا ہے ، جو حضرت سلیمانؑ کے بعد ، اُن کا جانشین ہوا تھا ، اور جو باپ کا سا "اولوالعزم" حکمران ثابت نہ ہوا تھا ، مگر اس تفسیر کی چُول بھی ٹھیک نہیں بیٹھتی کیونکہ ، نہ تو سلیمانؑ کے بعد اُن کے ناکارہ بیٹے اور وارث کی جانشینی سلیمانؑ کی "آزمائش" ہوئی اور نہ اُن کے رُجوع کرنے اور استحکامِ سلطنت کی دعاء سے اِس کا کوئی تعلّق ہوا ۔ کسی کے مرنے کے بعد اگر اُس کا بیٹا ناکارہ ثابت ہو تو اِس کو ، اُس کے باپ کی آزمائش کہیں گے ؟ اور کوئی شخص مرنے کے بعد اپنے بیٹے کی حکومت کے استحکام کی دعاء "ربّ ھَب لی" کہہ کے کر سکتا ہے ، ؟ اس دُعاء سے اس کا کوئی تعلّق ہوا ؟ اگر یہ ثابت کیا جاتا کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنی حیات ہی میں ، اپنے اِس ناکارہ لڑکے کو ، "کرسیٔ حکومت" عطا کر دی تھی ، اور پھر اُس کی نا اہلیّت سے حکومت کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا ، اور اس لیے اُنھوں نے استحکامِ سلطنت کی دعاء کی تھی تو کسی حد تک یہ تفسیر درست ہو سکتی تھی ، مگر واقعہ یوں ہے ہی نہیں ، لہٰذا یہ تفسیر بھی ناقابلِ اطمینان ہے ۔

دراصل اِن آیات کا تعلّق "سیاسیات" سے ہے، قصّہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بہت سے ملازم وہ تھے جو "بُت پرست" اور "کافر" تھے، منجملہ اُن کے ایک شخص "یرُبعام" بھی تھا، جسے حضرت سلیمانؑ نے اپنی مملکت کے شمالی صوبے کا گورنر بنا دیا تھا، یہ گورنر "کافر" تھا اور اُس کی خواہش یہ تھی کہ وہ مملکتِ سلیمانی پر قبضہ کر کے "ہیکل" کو مٹا کے بدستور "بُت خانے" تعمیر کرے، چنانچہ "یرُبعام" نے اس مقصد کے پیشِ نظر کچھ لوگوں سے سازباز کر کے حضرت سلیمانؑ کے خلاف ایک "سازش" کی، اور آمادۂ بغاوت ہو گیا مگر اس کو اُس وقت، بہت مختصر جماعت ہم خیال ملی، لہٰذا اُس نے سوچا کہ اچانک پایۂ تخت پر حملہ کر کے کرسئ حکومت پر قبضہ کر لے۔ حضرت سلیمانؑ صرف "بادشاہ" ہی نہ تھے کہ چوبیس گھنٹے مہماتِ سلطنت اور انتظامِ حکومت ہی میں وقت صرف کرتے بلکہ اُن پر رسالتی ذمّے داریاں بھی تھیں دوسرے وہ اپنے ملازمین اور رعایا کی طرف سے بدظن بھی نہ تھے، لہٰذا اُن کو اِس مخدود سازش کا علم اُس وقت تک نہ ہو سکا، جس وقت تک کہ "یرُبعام" نے بڑھ کر "یروشلم" پر حملہ نہ کر دیا، لاعلمی اور پھر اس کے سبب سے عدم طیاری کی بناء پر حضرت سلیمانؑ اِس اچانک حملہ کی فوراً مناسب روک تھام نہ کر سکے، اور "یرُبعام" کرسئ حکومت پر قابض ہو گیا۔

یہ تھی حضرت سلیمانؑ کی پیغمبرانہ استقامت و شاہانہ فراست کی "آزمائش"۔ "یرُبعام" اگرچہ اچانک حملہ کر کے تختِ حکومت پر قابض ہو گیا تھا (اَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّهٖ) مگر وہ مدبر و سیاست داں نہ تھا بلکہ محض ایک کم عقل بہادر، اور فراستِ جہانبانی سے

عاری ذی حوصلہ شخص تھا، اس لئے اُس کو محض "جَسَدٌ" کا لقب دیا گیا۔ "جَسَدٌ" سے "بے رُوح جسم" اور "بے جان لاش" مراد لینا صحیح نہیں ہے، قرآن نے "لاش" اور "بے جان جسم" کے لئے "سَوْاَةٌ" اور "بَدَنٌ" کا لفظ استعمال کیا ہے، ایک ابن آدم نے اپنے بھائی کو مار ڈالا پھر پریشان ہوا کہ لاش کو کیا کرے؟ تو اس کی تعلیم کے لئے ایک کوّا بھیجا گیا جو اُس کے سامنے زمین کھودنے لگا تاکہ وہ اس کو بتائے کہ:۔

كَيْفَ يُوَارِي سَوْاَةَ اَخِيْهِ "کس طرح وہ اپنے بھائی کی لاش
(مائدہ ۵) کو چھپائے ۔"

"فرعون" نے ڈوبتے وقت نجات چاہی تو جواب دیا گیا کہ:۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ "آج کے دن تو صرف تیری لاش
(یونس ۹) کو نجات دی جائے گی ۔"

دراصل "جَسَدٌ" کے معنی قالب اور ڈھانچہ کے ہیں جس میں جان ہو یا اُس میں زندگی کا کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور ملے، پیغمبروں کے ذکر میں ہے:۔

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا "اور ہمنے ان رسولوں کو جسّے ایسے نہیں دیئے تھے
يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ ہمیشہ
خٰلِدِيْنَ ۔ (انبیاء ۱) باقی رہنے والوں میں سے تھے ۔"

سامری نے سونے کو ڈھال کر جو بچھڑا بنایا تھا اُس کے بارے میں ہے کہ:۔

عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ "ایک ایسا قالب تھا جس میں سے
(اعراف ۱۸) آواز نکلتی تھی ۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ "جَسَدًا" جاندار جسم کو کہتے ہیں یا اُس قالب کو جس میں گو صحیح معنی میں زندگی نہ ہو، مگر اُس میں آثارِ حیات ضرور پائے جائیں یہ تعریف اُس انسان پر بھی صادق آتی ہے، جو عقل و فراست نہ رکھتا ہو، جو شرفِ انسانیت ہے، مگر وہ بولتا چالتا اور کھاتا پیتا ہو، "یربعام" اگرچہ تختِ سلیمانی پر قابض ہو گیا تھا، مگر وہ ایسا ہی تھا کہ اگرچہ بولتا چالتا انسان تھا مگر صاحبِ عقل نہ تھا، چنانچہ خواجہ احمد الدین صاحب مرحوم نے اپنی تفسیر "بیانُ لِلنّاس" میں زیرِ تذکرہ آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:۔

"البتہ بالتحقیق ہم نے سلیمانؑ کو آزمائش میں ڈالا اور اُسکی کُرسی (یعنی تختِ حکومت) پر ایک لا العقل (اور بے وقوف شخص) کو لا بٹھایا۔" (جلد ۶ صفحہ ۶۷)

"اَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّہٖ" سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اوّل تو اس باغی سردار نے، پوری مملکت پر قبضہ نہیں کیا تھا، بلکہ یکایک "پایۂ تخت" پر حملہ کر کے، کُرسیٔ حکومت پر قابض ہو گیا تھا، باقی مملکت، اُس کے اثر و اقتدار سے باہر اور محفوظ تھی، دوسرے وہ اُس "کُرسی" کا صحیح معنوں میں اہل نہ تھا بلکہ جیسے ایک شخص کو، جو بے وقوف بھی ہو، پکڑ کے تخت پر نکما پُتلا بنا کے بٹھا دیا یا ڈال دیا جائے، اسی طرح، اُس کو، وقتی طور پر، بلا اہلیت و استعداد محض لا کے ڈال دیا گیا تھا، "آزمائش" کے لفظ اور "اَلْقَیْنَا جَسَدًا" سے بھی، بہ خوبی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ وقتی حادثہ اور عارضی واقعہ تھا، کوئی مستقل فیصلہ نہ تھا اور دائمی تبدیلی نہ تھی ــــــــــ

چونکہ " توراۃ " کی کتاب " سلاطین " اوّل، باب ۱۱ میں اس بغاوت اور اُس باغی کی ناکامی کا ذکر تفصیلاً نہیں ہے اور صرف یہ آخری خبر مذکور ہے کہ :-

" اسی لئے سلیمان ' یرُبعام ' کے قتل کے درپے ہوا، پر یرُبعام اُٹھ کر مصر کو ' شاہ مصر " سیساق " کے پاس بھاگ گیا، اور سلیمان کی وفات تک مصر میں رہا ۔ " (باب ۱۱ آیت ۴۰)

اس لئے خیال یہ کیا گیا کہ حضرت سلیمانؑ کے عہد میں یرُبعام نے کچھ کامیابی حاصل نہیں کی تھی ، حالانکہ خود دوسری ہی آیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ کتاب " سلاطین " میں حضرت سلیمان کے پورے واقعات درج نہیں ہوئے ہیں، اور جو کچھ ہے وہ نامکمل و ناقص ہے ؛ چنانچہ ہے کہ :-

" اور سلیمان کا باقی حال ، اور سب کچھ جو اُس نے کیا ، اور اُس کی حکمت جو کیا ، وہ سلیمان کے احوال کی کتاب میں درج نہیں "

(سلاطین اوّل باب ۱۱ آیت ۴۱)

پھر اس کے بعد کتاب " تواریخ دوم " باب ۹ آیت ۲۹ میں بھی ہے کہ :-

" اور سلیمان کے باقی کام ، شروع سے آخر تک کیا ، وہ ناتن نبی کی کتاب میں اور سیلانی اخیاہ کی پیشین گوئی میں اور عیدو غیب بین کی رویتوں کی کتاب میں ، جو اُس نے یرُبعام بن نباط کی بابت دیکھی تھیں ، مندرج نہیں ہیں ۔ "

اس کے بعد ، دونوں جگہ صرف حضرت سلیمان کی وفات کا ذکر ہے ، اور یہ کہ اُن کی حکومت چالیس برس رہی ، مگر اس چالیس برس میں کیا کیا ہوا ؟ یہ کسی جگہ

مندرج و مذکور نہیں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے بعد جب اُن کا بیٹا "رجبعام" تخت نشین ہوا تو "یربعام" نے حملہ کیا، بلکہ بنی اسرائیل نے خود "یربعام" کو بلوا کے اپنا بادشاہ بنایا تھا، چنانچہ باب ۱۲ آیت ۲۰ میں ہے کہ:۔

"اور جب سارے اسرائیل نے سُنا کہ یربعام لوٹ آیا ہے، تو اُنھوں نے لوگ بھیج کر، اُسے جماعت میں بلوایا اور اُسے سارے اسرائیل کا بادشاہ بنایا اور یہوداہ کے قبیلے کے سوا کسی نے داؤدؑ کے گھرانے کی پیروی نہ کی ـــ"

اگر واقعتاً یربعام نے ابتدائے عہد سلیمانی میں کوئی کامیابی حاصل ہی نہیں کی تھی، تو "توراۃ" میں اُس کو "سازش" اور "قرآن" میں اُس کو "آزمائش" کیوں کہا گیا؟ اور اگر یربعام کی بغاوت ابتدا ہی، بلا کسی جدّ و جہد کے کلیتاً ناکام ہوگئی تھی تو "توراۃ" یہ کیسے بیان کرتی ہے کہ سلیمان نے اُس کو قتل کرنا چاہا تھا اور قرآن نے "اَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا" کیوں فرمایا؟۔ دراصل یربعام نے اس حد تک عارضی کامیابی حاصل کر لی تھی کہ اُس نے اچانک "پایۂ تخت" پر حملہ کر کے "تختِ حکومت" پر قبضہ کر لیا تھا مگر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس واقعہ سے ہمت نہ ہاری، وہ اس "آزمائش" سے گھبرا کے بھاگے نہیں۔ اُنھوں نے ہوش و حواس کھو کر اندازِ شکست اور راہِ فرار اختیار نہیں کیا، بلکہ تدبر و ہمت، عقل و ہوش اور سیاست و فراست کو کام میں لا کر، مناسب تدبیر کی، (ثُمَّ أَنَابَ) پورا ملک تو "یربعام" کے قبضہ میں آیا نہیں تھا، اُس کے ساتھ

لوگوں کی تعداد تو زیادہ تھی نہیں، چنانچہ تھوڑی سی کوشش اور جد و جہد سے حضرت سلیمانؑ نے یربعام کو بے دخل کر دیا۔ "یربعام"، مصر بھاگ گیا، اور حضرت سلیمانؑ دوبارہ "تختِ حکومت" پر فائز و قابض ہو گئے۔

جب حضرت سلیمانؑ دوبارہ تخت و تاج کے مالک ہو گئے، تو انھوں نے نہ صرف اپنی غیر ارادی لغزش، یعنی سلطنت کو غفلت سے کھو دینے کی غلطی، اور ودیعتِ الٰہی کی قرار واقعی حفاظت نہ کر سکنے کی چوک پر پردہ پوشی کی التجا کی (رَبِّ اغْفِرْ لِیْ) بلکہ اپنی حکومت کو مستقل، مضبوط ترین اور مثالی بنا دینے کی بھی دعاء کی :۔

رَبِّ هَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ "اے میرے پروردگار! مجھے ایسی حکومت عطا لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ (ص ۳) فرما جیسی میرے سوا کسی اور کو میسّر نہ ہو"

"توریت" کتاب "تواریخ دوم" باب ۱ آیت ۱۲ میں اس کا ذکر، دوسرے انداز سے، یوں ہے :۔

"سو حکمت و معرفت تجھے عطا ہوئی اور میں تجھے اس قدر دولت و مال اور عزّت بخشوں گا کہ نہ تو اُن بادشاہوں میں سے، جو تجھ سے پہلے ہوئے، کسی کو نصیب ہوئی، اور نہ کسی کو تیرے بعد نصیب ہو گی۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا، حضرت سلیمانؑ "پیغمبر" بھی تھے، اور "بادشاہ" بھی، مملکت کے سلسلے میں ان کی یہ چوک، بحیثیت "بادشاہ اور بربنائے "انسانیت" تھی اور پھر ان کا رجوع کرنا، ہوش و حواس نہ کھو کر، تدابیر سے، تختِ حکومت کو یربعام

سے دوبارہ واپس لے لینا بحیثیت "پیغمبر" اور بر بنائے "رسالت" تھا اسی لئے قصّہ کی ابتداء میں حضرت سلیمانؑ کا ذکر اِن الفاظ میں ہوا ہے :-

(۱) نِعْمَ الْعَبْدُ ، (۲) اِنَّهٗ اَوَّابٌ

(۱) نِعْمَ الْعَبْدُ — "وہ اچھے بندے تھے" یہ تعریف پیغمبر کی حیثیت سے ہے۔

(۲) اِنَّهٗ اَوَّابٌ — "وہ غلطی کرنے کے بعد جلد ہی رجوع کرنے والے تھے۔

یہ تعریف بہ حیثیت بادشاہ کی گئی ہے ، یہ ہے سورہ " صٓ " کی زیر بحث آیات کی تفسیر ، حکومت کھو کر پھر دوبارہ حاصل کرنے کے بعد ہی استحکام سلطنت اور مثالی حکومت کی دعاء موزوں ہو سکتی ہے ، ایک ناکارہ وارثِ تخت و تاج کو دیکھ کر شروع ہی میں حضرت سلیمانؑ ایک صالح اولاد اور لائق وارث تخت و تاج کی دعاء کرتے ، جیسا کہ حضرات ابراہیم و ذکریا علیہم السلام نے دعا کی تھی :-

(۱) رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ " اے میرے رب ! مجھے صالحین میں

(والصّٰفّٰت ۳) سے ایک فرزند عطا فرما ۔"

(۲) فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا (مریم ۱) " سو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا کر"

حضرت سلیمانؑ یہ نہ فرماتے کہ :-

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا " اے میرے پروردگار ! میری مغفرت فرما اور مجھکو

یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ (صٓ ۳) ایسی حکومت عطا کر کہ میرے سوا کسی اور کو میسر نہ ہو"

یہ دعاء بجائے خود اِس امر کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی "آزمائش" ہوئی ، اور یوں کہ عارضی اور وقتی طور پر اُن کے تختِ حکومت پر ایک احمق قابض ہوگیا ، اور پھر حضرت سلیمانؑ نے ، اُس سے حکومت چھینی ، اور اس غفلت پر

نہ صرف مغفرت چاہی بلکہ حکومت کی بقاء وغیر معمولی استحکام کی بھی استدعاء کی۔

رہا یہ سوال کہ حضرت سلیمانؑ کی یہ آزمائش ہوئی ہی کیوں ؟ سو اس کے بارے میں یہودیوں کی " توریٰۃ " کتاب۔ سلاطین اوّل " باب ۱۱ آیت ۱ تا ۳ کا بیان تو یہ ہے کہ :۔

" اور سلیمان بادشاہ، فرعون کی بیٹی کے علاوہ اور بہت سی اجنبی، عورتوں سے یعنی موابی، عمونی، ادومی، صیدانی، اور حتّی، عورتوں سے محبت کرنے لگا، یہ اُن قوموں کی تھیں جن کی بابت خداوند نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ تم اُن کے بیچ نہ جانا، اور نہ وہ تمہارے بیچ آویں، کیونکہ وہ ضرور تمہارے دلوں کو اپنے دیوتاؤں کیطرف مائل کر لیں گی۔ سلیمانؑ اُنھیں کے عشق کا دَم بھرنے لگا، اور اس کے پاس سات سو شاہزادیاں اس کی بیویاں اور تین سو حرمیں تھیں اور اس کی بیویوں نے اُس کے دل کو پھیر دیا۔ "

اور پھر آیت ۱۱ میں ہے کہ :۔

" اسی سبب سے خداوند نے سلیمان کو کہا، چونکہ تجھ سے یہ فعل ہوا اور تُو نے میرے عہد اور میرے آئین کو، جن کا میں نے تجھے حکم دیا، نہیں مانا، اس لئے میں سلطنت کو ضرور تجھ سے چھین کر تیرے خادم کو دوں گا ــــ "

مگر یہ سب محض " خرافات " ہے، حضرت سلیمانؑ " پیغمبر " ہو کر کبھی " بُت پرستی "

کرہی نہیں سکتے تھے، مگر مسلمانوں کی "روایات" کا بھی انداز کچھ ایسا ہی ہے۔

"صحیح بخاری" جلد ۲ صفحہ ۱۵۶ میں ہے :۔

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں، حضور صلعم نے ارشاد فرمایا، ایک بار سلیمانؑ نے کہا کہ آج رات میں ستّر عورتوں کا دورہ کروں گا اور ہر عورت حاملہ ہو کر ایک ایسا شہسوار پیدا کرے گی جو راہِ خدا میں جہاد کرے گا، سلیمانؑ کے ساتھی نے کہا "انشاء اللہ" کہو، لیکن سلیمانؑ نے نہ کہا، نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی عورت حاملہ نہ ہوئی صرف ایک عورت کے آدھا بچہ پیدا ہوا۔"

ظاہر ہے کہ اگر ایک "پیغمبر" اور "حکمراں" کا مشغلہ یہ ہو کہ "آج رات، میں ستّر عورتوں کا دورہ کروں گا" تاکہ اُس سے ایک شہسوار پیدا ہو۔ اور "اولاد" کو محض اپنے زورِ بازو کا نتیجہ سمجھے، اور توجہ دلانے پر بھی ایک پیغمبر "انشاء اللہ" کہنے سے صریحاً اغماض و اعراض کرے، وہ تندہی سے نہ تو نظمِ مملکت کر سکتا ہے اور نہ ہی فرضِ رسالت ادا کر سکتا ہے، لہٰذا اس کی آزمائش کرنی ہی چاہیئے تھی، مگر درحقیقت یہ روایت بھی محض "توریت" ہی کا فیض ہے۔ "انسائیکلو پیڈیا آف دی سوشل سائنس" میں "اسلام" سے متعلق مضمون نگار نے غلط نہیں لکھا ہے کہ :۔

"رسول اللہ کے بعد یہودی، عیسائی اور مجوسی تصورات نے اسلامی عقائد و نظریات کو متاثر کرنا شروع کر دیا، اسلام کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ایک منفرد مذہب ہے، اب ان حالات کے تحت، اُسے اپنے اس

دعوے کو برقرار رکھنے کے لئے اِس کے سوا چارہ ہی نہ تھا کہ وہ ان غیر اسلامی اثرات کے متعلّق یہ اعلان کر دے کہ یہ "روایات" خود رسول اللہ سے منتقل ہوتی ہوئی چلی آ رہی ہیں، اس طرح پہلی چند صدیوں میں، جو کچھ اسلام میں، باہر سے داخل ہوا، وہ "احادیث نبوی" کی مُہر لگ کر اسلام بنتا چلا گیا، نویں صدی، عیسوی (تیسری صدی ہجری) میں ان ہی "روایات" کے "مجموعے" مرتّب ہو کر "اسلام" کا مستقل "ماخذ" بن گئے "

دراصل حضرت سلیمانؑ کی اس "آزمائش" اور "جانچ" کی وجہ وہی ہے جو خود حضرت سلیمانؑ نے فرمائی تھی، اور خود قرآن ذکر کرتا ہے، یعنی:-

لِیَبْلُوَنِیٓ ءَاَشْکُرُ اَمْ اَکْفُرُ " تاکہ وہ آزمائش کرے کہ آیا میں اُسکا شکر گزار بندہ بنتا ہوں یا ناشُکرا۔" (نمل ۳)

"پیغمبروں" کی بڑی بڑی آزمائشیں ہوئی ہیں:-

مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ - (بقرہ ۲۶) " اُن پر ایسی ایسی تنگی اور سختی واقع ہوئی اور انھیں اس حد تک جنبشیں دی گئیں کہ پیغمبر اور ساتھی اُن کے سب ہی چلا اُٹھے کہ اب کب اللہ کی مدد آئیگی؟ "

"تاریخ" اپنے آپ کو دُہراتی رہتی ہے:-

تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ ہم ان ہی ایام کو بنی نوع انسان

کے درمیان برابر دُہرایا کرتے ہیں "۔ (آل عمران ۱۴۰)

چنانچہ محض "پیغمبر" و "غیر پیغمبر" کے فرق کے ساتھ "فلسطین" کی یہی تاریخ بجنسہٖ "افغانستان" میں دہرائی گئی ۔

۱۹۲۹ء میں شاہ امان اللہ خاں کے خلاف ملک میں ایک مختصر سی جماعت نے "سازش" کی اور چونکہ امان اللہ خاں کو نہ ملک کی طرف سے بے اطمینانی تھی نہ ارکانِ حکومت سے بدظنی، لہٰذا وہ زیادہ چوکنا اور ہوشیار نہ رہے اور اس "سازش" سے وہ اُس وقت تک باخبر نہ ہو سکے جو وقت تک کہ "بچہ سقہ" نے، جو محض ایک معمولی فوجی آدمی تھا، ڈاکوؤں کی حمایت حاصل کرکے پایۂ تخت کابل پر یکایک حملہ نہ کر دیا ۔ امان اللہ خاں اس اچانک حادثہ سے ایسے حواس باختہ اور سراسیمہ ہو گئے کہ ۱۴ر جنوری ۱۹۲۹ء کو افغانستان سے بھاگ کھڑے ہوئے، اور بچہ سقہ نے ۱۷ر جنوری کو تختِ کابل پر قبضہ کر لیا، مگر "بچہ سقہ" احمق تھا ۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ اس نے باقی ملک کی طرف فوراً کوئی توجہ نہ دی بلکہ اُس نے مقبوضہ پایۂ تخت ہی کے قبضہ کو کافی سمجھا اور پھر وہاں بھی اُس نے ایسی ایسی ستمرانی اور ہنگامہ آرائی شروع کر دی کہ لوگ اُس سے بالکل بگڑ گئے، اور بالآخر اُس نے چند ہی ماہ کے بعد نہ صرف سلطنت، بُری طرح کھو دی بلکہ پھانسی بھی چڑھا۔ امان اللہ خاں اگر اس "آزمائش" سے گھبرا کے بھاگ نہ جاتے اور ہوش و حواس درست رکھ کر، اس طرف "رجوع" کرتے تو اُن کو دائمی محرومی کبھی نصیب نہ ہوتی، مگر اُنھوں نے بروقت ہمت ہار دی اس لئے ہمیشہ کے لئے بازی بھی ہار دی ۔ برخلاف اس کے نادر خاں نے جو ہمت کی، رجوع کیا، ذہانت و فراست سے

کام لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ حکومت سپرد کر دی۔

امان اللہ خاں نہ "اَنَابَ" تھے نہ "اَوَّابَ" اس لئے آج تک جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کی مدد تو صبر و جرأت اور ہمت و استقامت دکھانے والوں ہی کے ساتھ ہے۔ نہ کہ بزدلوں، گھبرا جانے والوں اور بھگوڑوں کے ساتھ۔؟

(۱) وَيَهْدِىٓ إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ (رعد ۴) "اور اللہ تو صرف اُسی کو راہ بتاتا ہے جو اناب ہو۔"

(۲) وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ "اور اگر کسی کی کچھ آزمائش ہو گئی اور وہ منہ اٹھا کر بھاگ گیا تو سمجھو کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں ہی کھو بیٹھا۔" (حج ۲)

(۳) سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا "اللہ کا جو دستور اگلوں کے معاملے میں رہا ہے وہی اب بھی ہے اور تم کبھی بھی اس دستور میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔" (احزاب ۸)

علامہ ابن خلدون (وفات ۸۰۸ھ/۱۴۰۶ء) نے اپنے شہرۂ آفاق "مقدمہ" میں بطور کلیہ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جس ملک کا "پایہ تخت" مفتوح ہو جاتا ہے اُس ملک کی شکست مکمل ہو جاتی ہے، اور اگر "پایہ تخت" مفتوح نہیں ہوتا تو حکومت اپنی قوّت کے تناسب کے مطابق مدافعت کر سکتی ہے۔ لاریب کہ علامہ موصوف ایک دیدہ ور فلسفی مورخ تھے، اور مثالیں اس کی بھی موجود ہیں کہ پایہ تخت کے مفتوح ہو جانیکے

بعد حکومت کا سرے سے خاتمہ ہی ہو گیا۔ مگر اُن کا یہ خیال کہ یہ قاعدۂ کلّیہ ہے، صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر مضمون بھی شاہد ہے کہ " پایۂ تخت " کے مفتوح ہو جانے سے پورا ملک مفتوح نہیں ہوا۔ مصر کے نامور مصنّف اور موجودہ وزیرِ تعلیم، جناب ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے بھی اپنی مشہور کتاب " ابن خلدون " میں جسے انھوں نے ۱۹۱۷ء میں فرنچ زبان میں لکھ کر فرانس کی " سربون یونیورسٹی " سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے، علّامہ ابن خلدون کے اس نظریۂ کلّیہ سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ:۔

" یہ نظریہ اس قدر عام نہیں ہے جتنا ابن خلدون خیال کرتا ہے کیونکہ کسی سلطنت میں حبِ وطنیت کا احساس قوی ہوتا ہے تو پایۂ تخت کے مفتوح ہونے سے گو سلطنت کی بنیاد ہل جاتی ہے لیکن پوری سلطنت کا خاتمہ نہیں ہو جاتا بلکہ مفتوح قوم فوراً یا کچھ دنوں کے بعد، موقع کو تلاش کرتی ہے۔ اور مفتوح شہر کو دوبارہ واپس لے لیتی ہے۔ مثلاً ہم کو معلوم ہے کہ " لیٹن صلیبیوں " کے ہاتھوں سے قسطنطنیہ کی فتح نے " بیزنطینی " قوم کو جنگ سے باز نہیں رکھا یہاں تک کہ اُس نے اپنے پایۂ تخت کو دوبارہ واپس لے لیا۔"

چونکہ علّامہ ابن خلدون نے تاریخ کو سائنسی حیثیت دیدی ہے، جس وجہ سے اُن کے خیالات " مسلّمات " کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں، اس لئے اس غلطی کی طرف نشان دہی ضروری معلوم ہوئی۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک وضاحت اور کر دی جائے، سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ کی یہ دعا کہ :-

"مجھ کو ایسی حکومت عطا کر جو میرے سوا کسی کو نہ ملی ہو"

مقبول ہوئی تو اُن کو کون سی انوکھی حکومت ملی، جو اُن کے سوا کسی اور کو نہ پہلے ملی تھی اور نہ آئندہ کبھی کسی کو ملے گی ؟ -

اس کے جواب کے لئے قصۂ آدم کو سامنے لائیے، آدم کی تخلیق کے بعد کائنات کی تمام طاقتوں کو اس خلیفۂ ارضی (زمین کے حاکم) کے سامنے سرِ اطاعت جھکانے کا حکم دیا گیا تھا، کیونکہ اس کے بغیر حکومتِ ارضی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ اس حکم پر کائنات کی تمام طاقتوں نے سرِ اطاعت خم کر دیا تھا، چنانچہ اس بناء پر انسان نے کائنات کی ہر طاقت کو اپنے علم سے محکوم بنا کر اس سے کام لینا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ جاری ہے، اور جاری رہے گا، تا آنکہ ایک دن وہ آئے گا جب کائنات کی ساری طاقتیں انسان کی محکوم و منقاد ہوں گی، البتہ ایک طاقت و مخلوق ایسی تھی جس نے انسان کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا، یہ "جنات" تھے۔ جن کا سردار یا نمائندہ وہ تھا جو مردود ہو کر "ابلیس" کہلایا، چنانچہ "جنات" نے کبھی کسی انسان کی محکومیت اختیار نہیں کی۔

جب حضرت سلیمانؑ نے یہ دعا کی کہ مجھے ایسی حکومت عطا کر جو میرے سوا کسی اور کو نہ ملی ہو تو استثنائی طور پر اس باغی طاقت یا مخلوق یعنی "جنات" کو بھی اُن کا محکوم بنا دیا گیا تھا۔

(۱) وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّھَا شَھْرٌ وَّرَوَاحُھَا شَھْرٌ ..... وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ یَدَیْہِ بِاِذْنِ رَبِّہٖ (سبا ۲) "اور ہوا کو سلیمانؑ کے تابع کر دیا کہ اس کی صبح کی منزل مہینے بھر کی راہ ہوتی اور اسی طرح اُس کی شام کی منزل مہینے بھر کی راہ ہوتی ..... اور جنات کو بھی سلیمانؑ کے تابع کر دیا تھا، جو اُس کے سامنے خدمت انجام دیتے تھے اُس کے پروردگار کے حکم سے"

(۲) فَسَخَّرْنَا لَہُ الرِّیْحَ ..... وَالشَّیٰطِیْنَ (ص ۳) "سو ہم نے اُس کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا تھا ..... اور شیاطین کو بھی"

(۳) وَمِنَ الشَّیٰطِیْنِ مَنْ یَّغُوْصُوْنَ لَہٗ - (انبیاء ۶) "اور شیاطین کو مسخر کر دیا تھا جو ان کے لیے غوطے بھی لگاتے تھے"

(۴) وَحُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ جُنُوْدُہٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّیْرِ (نمل ۲) "اور ہم نے اکٹھے کر دیئے تھے سلیمن کے لئے جنوں اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر"۔

کائنات کی ساری طاقتیں، سر اطاعت جھکا کر انسان کی حکومت تسلیم کر چکی تھیں لہذا ہوا، پانی وحوش وطیور وغیرہ کی حکومت ایسی انوکھی حکومت نہ تھی جو سلیمانؑ کے علاوہ کسی اور کو نہ ملتی ۔ ایسی حکومت جو اُن کے سوا اور کسی کو نہ ملی ہو، ملنے کی ایک اور صرف ایک صورت یہی تھی کہ اُس مخلوق یا طاقت کو بھی سلیمانؑ کے تابع کر دیا جائے، جس نے انسان کو حقیر سمجھ کر اُس کی محکومیت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

یہ طاقت یا مخلوق ایک اور صرف ایک تھی "جنات"۔ لہذا اس کو سلیمانؑ

کے تابع کر دیا گیا، جنات کے سردار یا نمائندہ ابلیس نے انسان کے نمائندہ یا سردار آدم کو ذلیل سمجھ کر اُس کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا تھا اب جو ایک "اولادِ آدم" کی اُن پر حکومت قائم ہوگئی تو اِس محکومیت کو "ذلّت کی مصیبت" سے تعبیر کیا گیا:۔

فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَنْ "سو جب سلیمان گر پڑے تب جنات کو لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ معلوم ہوا کہ وہ مر گئے ہیں اگر اُنہیں غیب کا علم مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ہوتا تو وہ اس ذلت کی مصیبت میں ہرگز (سبا ۲) نہ رہتے"

یہ تھی وہ انوکھی حکومت جو حضرت سلیمانؑ کو ملی تھی، کائنات کی ہر طاقت انسان کے لئے مسخر ہے، وہ انسان کے آگے سر جھکا چکی ہے۔ چنانچہ اس وقت تک اپنے علم کے زور سے وہ کائنات کی بہت سی طاقتوں پر حکم چلا رہا ہے، ہوا، پانی، آگ، بجلی، ایتھر ساری طاقتیں انسان کا حکم بجا لا رہی ہیں۔ باقی طاقتیں بھی آئندہ انسان کی حکم برداری کریں گی، البتہ "جنات" پر نہ تو کبھی حضرت سلیمانؑ سے پہلے کسی انسان نے حکومت کی تھی اور نہ اُن کے بعد، آئندہ قیامت تک کوئی انسان اُن پر حکومت کر سکے گا"

یہ تھی وہ انوکھی حکومت جو حضرت سلیمانؑ کے سوا کسی کو نہ پہلے ملی تھی اور نہ آئندہ ملے گی۔

معذرت { اس کتاب کی طباعت میں بعض معقول و غیر معقول وجوہ کی بنا پر حیرت انگیز تاخیر ہوئی جس کے لئے ناشرین بیحد نادم اور متاسف ہیں۔ ف۔ ا